جلد ۱۴۵ ماہ شوال المکرم سنہ ۱۴۱۰ھ مطابق مئی سنہ ۱۹۹۰ء عدد ۵

مضامین

شذرات

دینی تعلیم مسلمانوں کے لیے ہر زمانہ اور ہر دور میں ضروری رہی ہے۔ لیکن اس زمانہ میں اس کی جانب سے کسی قسم کی کوتاہی اور معمولی غفلت بھی ان کے لیے روا نہیں ہے، کیونکہ اس کے بغیر نہ ان کا عقیدہ و ایمان سلامت رہ سکتا ہے اور نہ ان کی قومی و ملی خصوصیات باقی رہ سکتی ہیں، مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، ان کے پرسنل لا اور گذشتہ روایات کا تحفظ بھی اسی پر موقوف ہے، ان کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ وہ اپنے دین و مذہب سے وابستہ رہ کر ہی دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوسکتے ہیں، اور یہ بدیہی حقیقت ہے کہ دین و مذہب سے مسلمانوں کی وابستگی اور تعلق اور نئی نسلوں کو ایمان اور اسلامی عقائد پر قائم رکھنے کے لیے دینی تعلیمی اداروں اور مذہبی درسگاہوں کا وجود نہایت ضروری ہے۔

گو آزادی کے بعد سے مسلمان بڑے نازک اور پُر آشوب دور سے گذر رہے ہیں لیکن وہ مدرسوں اور مذہبی تعلیم گاہوں سے بالکل بے پروا نہیں رہے، انھوں نے اپنے قدیم اداروں اور دینی درسگاہوں کو نہ صرف باقی رکھا، بلکہ نئے دینی مدرسے بھی قائم کیے، ان کی دلچسپی اور دینی شغف سے اب چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی بڑے بڑے دینی تعلیمی ادارے قائم ہوتے جارہے ہیں، جن کو اور قدیم مدارس کو بھی مسلمانوں کی حرارت ایمانی مزید وسعت، ترقی اور استحکام عطا کر رہی ہے، یہ بات جہاں خوشی و مسرت کی ہے وہیں یہ صورت حال تکلیف اور دکھ کی بھی ہے کہ مدارس سے مسلمانوں کو جو فیض پہونچنا چاہیے تھا وہ نہیں پہونچ رہا ہے، کیونکہ اب ان کی حیثیت

اسلام کے مضبوط قلعوں اور مستحکم کارخانوں کی نہیں رہ گئی ہے، جن سے کبھی دین و ایمان کے محافظ اور قوم و ملت کے پاسبان پیدا ہوتے تھے، اور ایسے افراد ڈھل کر نکلتے تھے جو محبت معرفت اور یقین سے سرشار ہو کر اسلام کی عظمت و صداقت کا جیتا جاگتا نمونہ ہوتے تھے اور جن کا وجود نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کے لیے باعث خیر و برکت ہوتا تھا۔

عموماً اس دردناک صورت حال کا ذمہ دار محض طلبہ و اساتذہ کو قرار دیا جاتا ہے لیکن کیا اس کے ذمہ دار خود وہ مسلمان نہیں ہیں جو مدارس کو صرف چندہ دے دینا کافی سمجھتے ہیں اس کے بعد نہ ارباب مدارس سے کسی قسم کے احتساب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ تعلیم و تربیت کے مسائل پر کبھی سنجیدگی اور دردمندی سے غور و خوض کرتے ہیں، رہے منتظمین تو انھوں نے طلبہ و اساتذہ کو جو مسلمانوں کا سب سے قیمتی اور قابل قدر گروہ تھا اس قدر ناکارہ بنادیا ہے کہ نہ اس کے پاس عزت نفس اور خودداری نام کی کوئی چیز رہ گئی ہے اور نہ جرأت ایمانی اور حق گوئی سے اس کو کوئی واسطہ رہ گیا ہے، مدارس کے کارپردازوں کی خود غرضی و مفاد پسندی سے ان کے حصے بخرے ہوتے جارہے ہیں، اور باہم ہر طرح کا جدال جاری ہے۔

یہ باتیں تلخ ضرور ہیں مگر خلاف واقعہ نہیں ہیں، تاہم ان سے قطع نظر مدارس کا سب سے بڑا مسئلہ ان کے نصاب و نظام تعلیم کا ہے، جس کو روح عصر کے مطابق بنائے بغیر ان سے کسی مفید اور بہتر نتیجہ کی توقع نہیں کی جاسکتی، علمائے کرام اگر گوشوں اور زاویوں سے نکل کر اپنا اصلی فرض ادا کرنا چاہتے ہیں اور قوم و ملک کی قیادت و رہبری کی زمام کار اپنے ہاتھوں میں لے کر انھیں تباہی و بربادی سے بچانا چاہتے ہیں تو انھیں موجودہ حالات و مسائل سے باخبر اور نئی ضرورتوں اور مطالبوں سے واقف ہونا ہوگا۔ اور اسلام کے پیغام و دعوت کو عصری تقاضوں کے مطابق پیش کرنے کے لیے نئی زبان، نئے اسلوب اور نئے انداز کو

اختیار کرنا ہوگا، اس کے لیے عربی مدارس کے نصاب میں نئے علوم و مضامین کا اضافہ اور درس و تدریس کا پرانا اور غیر مفید طریقہ چھوڑنا ناگزیر ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے محبوب موضوعات میں ایک موضوع "عربی دینی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم میں اصلاح" بھی تھا جس پر اپنی وزارت تعلیم کے ابتدائی دور میں لکھنؤ کانفرنس میں مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے انھوں نے اپنے خیالات تفصیل سے پیش کیے تھے، خوشی کی بات ہے کہ اب اس ضرورت کا احساس عام طور پر ہو رہا ہے، مالیگاؤں کے بعد خدا بخش لائبریری پٹنہ کی طرف سے رانچی میں اس پر ۷، ۸، ۹ مئی کو ایک سیمینار ہوا جس کا دعوت نامہ اس خاکسار کو بھی ملا تھا، موضوع سے دلچسپی اور اس کی اہمیت نیز لائبریری کے ڈائرکٹر اور اپنے کرم فرما ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے متعدد خطوط اور تار کی بنا پر اس میں شرکت کا قطعی ارادہ بھی تھا لیکن عین وقت پر بعض موانع کی وجہ سے اس میں شرکت نہیں ہو سکی جس کا افسوس ہے، خدا کرے یہ سیمینار کامیاب اور نتیجہ خیز رہا ہو۔

اس سے زیادہ اہم اور قابل توجہ مسئلہ مسلمان بچوں کی ابتدائی بنیادی تعلیم کا ہے، اگر مسلمانوں نے اس کی نزاکت و اہمیت کو نہیں سمجھا اور اپنے بچوں کو سرکاری پرائمری اسکولوں میں داخل کر دیا تو اس سے بڑا کوئی دینی و ایمانی خسارہ نہ ہوگا، آیندہ نسلوں کو دین و مذہب سے جوڑے رہنے اور ایمانیات و عقائد پر قائم و باقی رکھنے کے لیے مسلمانوں کی ہر بستی اور گاؤں میں آزاد مذہبی مکاتب اور ابتدائی تعلیم کے مدارس کا قیام ضروری ہے، دینی تعلیمی کونسل اترپردیش بہت طویل عرصہ سے اس کے لیے سرگرم جد و جہد کر رہی ہے، یہ کونسل ہر مکتب فکر کے افراد پر مشتمل ہے اور اس کی شاخیں دوسرے صوبوں میں بھی قائم ہو گئی ہیں، مگر وقت اور حالات کا اقتضا یہ ہے کہ اس تنظیم کو مزید موثر، توانا اور فعال بنایا جائے، اور اس میں کسی قسم کی کاہلی اور بے پروائی نہ کی جائے۔

مقالات

ماضی اور حال کی عربی نثر نگاری کا ایک تنقیدی جائزہ

از

پروفیسر محمد راشد ندوی صدر شعبہ عربی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

محمد بن عبدالوہاب کی اصلاحی تحریک

اس عرصہ میں نجد سے ایک تحریک محمد بن عبدالوہاب کی قیادت میں وجود میں آئی اگرچہ یہ ایک خالص مذہبی تحریک تھی لیکن حالات نے اسے سیاسی رخ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نجد سے یہ تحریک اٹھ کر دولت عثمانیہ کے پھیلے ہوئے علاقہ میں اپنے اثرات چھوڑے گی جس نے کچھ عرصہ تک دولت عثمانیہ کو پریشان کر دیا تھا۔ چنانچہ اس تحریک کو دبانے کے لیے دولت عثمانیہ نے مصر کے عوام اور حکومت سے بھی مدد لی۔ اس تحریک سے ایک نتیجہ یہ تو ضرور نکلا کہ عوام یہ سوچنے لگے کہ حکومت کے خلاف بھی آواز اٹھائی جا سکتی ہے اور کوئی بھی تحریک اگر اس کے پیچھے عوام کی طاقت ہو تو بڑی سے بڑی حکومت اس کو کچل نہیں سکتی۔ چنانچہ وہابی تحریک سے یہ فضا تمام عرب ممالک میں پیدا ہو گئی۔ اور ایسا لگتا ہے کہ اب حالات کسی مرد مومن و مجاہد کے لیے ہموار ہو رہے ہیں جو اپنی زبان و قلم سے عربوں میں زندگی پیدا کر دے گا

اور اپنے اخلاص اور ایمان کی طاقت سے بادشاہوں کے دلوں کو بھی ہلا دے گا۔ وہ مرد مجاہد اصلاً عرب نہیں ہوگا لیکن اپنے کردار، اپنے اعمال اور اپنے اخلاص کی بدولت عربوں کی آنکھ کا تارا بن جائے گا۔ اور وہ شخصیت جمال الدین الافغانی کی ہے

جمال الدین افغانی کے اصلاحی کارنامے

جمال الدین الافغانی افغانستان یا ایران میں پیدا ہوئے ان کی ابتدائی تعلیم افغانستان اور ہندوستان میں ہوئی۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی ذہن اور بیدار مغز بنایا تھا۔ علم کی راہ میں خاک چھاننے والا یہ مفکر ہندوستان، ایران، حجاز اور ترکی تک پہونچا اور جہاں جہاں اس کو علم کی شعاع نظر آئی وہ اس سے استفادہ کرتا۔ اس کے علاوہ وہ ان تمام علاقوں کی سیاسی سماجی اور مذہبی زندگی کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی پیدائش کے کچھ ہی عرصہ بعد ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کا واقعہ پیش آیا اور اس کے جو اثرات ہوئے، افغانی نے اس کا بھی جائزہ لیا۔ اس لیے وہ طائر لاہوتی کی طرح فضاؤں میں اپنا آشیانہ تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اپنی پرواز کے دوران جو سرزمین اسے سب سے زیادہ بھائی وہ مصر کی تھی۔ اس کی دوربین نگاہوں نے تاڑ لیا تھا کہ یہ دنیائے اسلام کا علمی، ادبی اور سیاسی لحاظ سے سب سے زرخیز علاقہ ہے۔ اس کے دامن میں الازہر ہے جو دنیائے اسلام کے علماء کے ذہن و فکر کی جلا کا سرچشمہ۔ اور اس کے سب سے بڑے شہر قاہرہ کو ہر اعتبار سے دنیا کے تمام اسلامی ملکوں پر فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ وہ ۱۸۷۱ء میں ایران اور حجاز ہوتا ہوا قاہرہ پہونچا اور بڑی خاموشی سے مصر کا جائزہ لیا اور اپنے کام کو یہیں سے شروع کیا۔ سب سے پہلے وہ ایک معلم اور مدرس کے بھیس میں عوام کے سامنے آئے۔

یہ بھی قدرت کا عجیب و غریب کرشمہ ہے کہ ایک غیر عرب عربوں کو عربی زبان و ادب

اور عربی ثقافت و تمدن بتانے اور پڑھانے اور عوام کو زندگی کا درس و پیغام سنانے کے لیے آیا۔ در اصل وہ ایسا معلم تھا جس کی ہر جگہ تعلیم گاہ تھی اور جس کا ہر لمحہ تدریس میں گذرتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ قدرت نے جہاں اس کے جسم کو مضبوط بنایا تھا وہاں اس کے اندر اتنا حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ سکھانے اور بتانے میں اس کو مزا آتا اور تھکن کے بجائے وہ اپنے اندر تازگی محسوس کرتا تھا۔ اور تھوڑے عرصہ میں عوام کے دلوں میں اترنے کی کوشش کرتا۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء سے لے کر ۱۸۷۹ء تک وہ مصر میں رہا اور مصر کے یہ آٹھ سال آٹھ صدی کے برابر ہیں۔ اس عرصہ میں اس نے یہاں کے لوگوں کے ذہن کو بدل دیا اور ان میں زندگی کے مسائل کو سمجھنے کا ملکہ پیدا کر دیا اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اس نے صحیح عربی بولنے اور لکھنے کا ذوق پیدا کیا۔ چنانچہ آٹھ سال کے عرصہ میں اس کے حلقہ میں بڑے بڑے عالم، مفکر، خطیب اور سیاستداں پیدا ہوئے۔ اور جب ان کو آٹھ سال کے بعد ان کی علمی اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے مصر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تو افسوس کے باوجود ان کا ضمیر مطمئن تھا کہ جو کام انھیں کرنا تھا اسے کر دیا اور ان کے سائے میں پلنے والے شاگردوں کی جماعت ان کے کاموں کو آگے بڑھائے گی۔

جمال الدین افغانی کی حیثیت مصر میں ایک سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی مصلح کی تھی اور ان کی اصلاح کا دائرہ عوام و خواص دونوں میں پھیلا ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے نظریات و افکار کو لوگوں تک پہونچانے کے لیے ایسی آسان اور سلیس زبان استعمال کی جس میں تصنع اور تکلف کا بالکل شائبہ نہیں تھا۔ تحریر کی طرح ان کی تقریریں بھی مصری عوام کے دل اور ضمیر کی آواز ہوتی تھیں چنانچہ اپنے محبوب رہنما کے مصر سے جانے

کے بعد بھی وہ اس کے افکار و نظریات کو جاننے کے لیے اس کے شاگردوں سے رجوع کرتے تھے۔ قدرت نے اس کے شاگردوں کے حلقہ میں ایک ایسا شاگرد بھی پیدا کیا جو اپنے علم، اپنے اخلاص، اپنے تدبر اور اپنی زبان و بیان کے لحاظ سے یکتائے روزگار تھا اور جس میں افغانی کی فکر و روح رواں دواں تھی۔ وہ تھے شیخ محمد عبدہ۔

شیخ محمد عبدہ کی مساعی جمیلہ

شیخ محمد عبدہ ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گاؤں کے کھاتے پیتے کسانوں میں تھے جب وہ چار سال کے ہوئے تو انھیں گاؤں کے مکتب میں پڑھنے کے لیے بھیجا گیا۔ عام طور سے گاؤں کے مکتبوں میں سب سے پہلے بچوں کو کلام پاک حفظ کرایا جاتا تھا۔ شیخ عبدہ نے بھی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ہی کلام پاک حفظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد ثانوی تعلیم کے لیے انھیں طنطا شہر میں جو ان کے گاؤں کے قریب ہی تھا، جامعہ احمدی میں ان کے والد نے بھیج دیا۔ یہاں ازہر کے نصاب کے مطابق تعلیم ہوتی تھی۔ جن اداروں میں ازہر کا نصاب تعلیم رائج تھا ان میں صرف عربی زبان، فقہ اور نحو و صرف کی تعلیم ہوتی تھی۔ طریقہ تعلیم بڑا پیچیدہ اور اکتا دینے والا ہوتا تھا۔ شیخ عبدہ اگرچہ بہت ذہین تھے اور تعلیم جاری رکھنے کے شوق میں جامعہ احمدی میں داخل ہوئے تھے لیکن وہاں کے طریقۂ تعلیم سے گھبرا کر ایک دن طنطا شہر چھوڑ کر اپنے گاؤں بھاگ آئے اور یہ فیصلہ کیا کہ گاؤں میں دوسرے کسان بچوں کی طرح کاشتکاری میں لگ جائیں گے۔ لیکن ان کے والد کو اپنے بیٹے کو پڑھانے کی بڑی تمنا تھی چنانچہ اصرار کر کے اور بہت سمجھا بجھا کر پھر طنطا لے گئے۔

اتفاق سے اس وقت طنطا میں شیخ درویش نام کے ایک عالم موجود تھے۔ یہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے بڑے شائق اور مدارس کے نصاب تعلیم سے نہایت بیزار تھے انھوں نے

شیخ عبدہ کو اپنی شاگردی میں لے لیا اور اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ الگ سے اپنے طریقے سے انھیں پڑھانے لگے۔ اس طرح شیخ عبدہ کو مایوسی اور تاریکی کی فضا سے نکال کر امید کی فضا میں لائے اور آہستہ آہستہ طنطا میں ثانوی تعلیم کا مرحلہ ختم ہوا۔ اس وقت شیخ کی عمر تقریباً سولہ سال کی ہو چکی تھی۔ اس کے بعد آخری مرحلہ کی تعلیم کے لیے وہ طنطا سے قاہرہ آئے اور جامعہ ازہر میں داخلہ لیا۔

جامعہ ازہر کا خراب حال

اس وقت ازہر کا حال بہت ابتر تھا۔ یہ قدیم یونیورسٹی اس مسجد سے وابستہ ہے جو صدیوں پہلے تعمیر کی گئی تھی اور جس میں عبادت کے ساتھ ساتھ تعلیم و تدریس کا بھی اعلیٰ انتظام تھا لیکن مسلمانوں اور عربوں کے زوال اور ذہنی و فکری انحطاط کا اثر اس ادارہ پر بھی پڑتا رہا بالآخر نوبت یہاں تک پہونچی کہ اس میں پڑھنے والے کچھ کتابوں کے نام سے تو واقف ہو جاتے لیکن زندگی کے مسائل سے انھیں کچھ بھی دلچسپی نہ پیدا ہوتی۔ مایوسی اور بدنظمی کے ماحول میں تعلیم پانے والے یہاں کے طلبہ تعلیم پانے کے بعد عوام کے لیے بوجھ بن جاتے اور صدقات و خیرات پر زندگی گذارنے کے لیے پہلے ہی سے اپنا ذہن بنائے ہوتے۔ ازہر کی مسجد کا اندرونی ہر ستون ایک درس گاہ کی حیثیت رکھتا تھا، جہاں ایک کرسی پر استاذ بیٹھتا اور طالب علم فرش پر بیٹھتے تھے۔ اس طرح ایک ہی وقت میں پوری مسجد میں ہر ستون کے پاس تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا اور طلبہ اپنے ذوق و صلاحیت کے اعتبار سے جس مضمون کا چاہتے انتخاب کر کے اس سے متعلق حلقہ میں بیٹھ جاتے۔

تعلیم کے لیے نہ عمر کی قید تھی نہ سال کی اور نہ حاضری کی پابندی ضروری تھی ازہر میں تعلیم پانے والے طلبا کے لیے اوقاف کی طرف سے کچھ وظیفے مقرر تھے جو روٹیوں

کی شکل میں انھیں مل جاتے۔ مسجد سے ملحق رواق (HOSTEL) تھے جن میں طلبا رہتے تھے۔
ان ہوسٹلوں کی نہ صفائی کا کوئی انتظام تھا اور نہ ان میں رہنے والے بچوں کی نگرانی کا کوئی
خیال۔ اس طرح پورا ازہر افراتفری کا شکار تھا۔ نصاب تعلیم میں وہی کتابیں پڑھائی جاتی
تھیں جو دور انحطاط میں لکھی گئی تھیں اس طرح اساتذہ طلبہ میں لکھنے پڑھنے کا ذوق
پیدا کرنے سے قاصر رہتے۔ احمد امین نے شیخ محمد عبدہ کے حوالہ سے زعماء الاصلاح میں
لکھا ہے کہ "بلاغت کے استاذ شیخ احمد رفاعی جو بلاغت کی سب سے بڑی کتاب پڑھاتے
تھے وہ ایک خط بھی صحیح عربی زبان میں نہیں لکھ سکتے تھے اور بڑی سادگی سے فرماتے
تھے کہ لکھنے اور انشاء کی تربیت تو نئے طرز کے اسکولوں میں دی جاتی ہے[1]"

خود علامہ شبلیؒ نے شام و مصر کے سفرنامہ میں ازہر کی صورت حال کی بڑی اچھی تصویر
کھینچی ہے، وہ فرماتے ہیں:

> "مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامعہ ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی
> کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا۔ ایک ایسا دار العلوم جس میں دنیا کے ہر حصہ کے
> مسلمان جمع ہوں جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ پونڈ سے کم نہ ہو، جس کے طالبعلموں
> کی تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو اس کی تعلیم و تربیت سے کیا کچھ امید نہیں ہو سکتی
> تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ بجائے فائدہ پہونچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد
> کر چکا ہے اور کرتا جاتا ہے۔ تربیت و معاشرت کا جو طریقہ ہے اور جس کا میں ابھی
> تذکرہ کر چکا ہوں اس سے حوصلہ مندی، بلند نظری، جوش ہمت غرض تمام شریفانہ
> اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے، میں نے یہاں ایسے طلبہ دیکھے ہیں جن کے عزیز

۱؎ احمد امین: زعماء الاصلاح ص ۱۸۸۔

> اور نہایت قریب عزیز چچا ماموں وغیرہ خود اسی شہر میں بڑے بڑے معزز عہدوں
> پر ہیں اور ان کی تمام ضروریات کے متکفل بھی ہیں تاہم چونکہ یہ طلبہ ازہر میں
> رہتے ہیں اس لیے ان کو عام بازار میں ہاتھ پھیلا کر روٹیاں لینے میں ذرا بھی شرم
> نہیں آتی۔ طالبعلموں کی دناءت اور پست حوصلگی کا یہ حال ہے کہ بازار میں
> پیسہ کی ترکاری خریدتے ہیں تو کنجڑے کو قسم دلاتے جاتے ہیں برأس سیدنا
> الحسین یعنی تجھ کو امام حسینؓ کے سر کی قسم ہو اچھی قیمت بتانا۔ کیا اس قسم کے
> تربیت یافتہ لوگوں سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کی عظمت و شان
> بڑھائیں گے۔ ہمارے ملک میں اس قسم کے جو مدرسے ہیں ازہر ان سے بھی
> گیا گزرا ہے۔ اس سے زیادہ افسوس تعلیم کی ابتری کا ہے۔ یہاں مستقل اور
> اصل طور پر صرف فقہ اور نحو کی تعلیم ہوتی ہے اور دونوں کے لیے آٹھ آٹھ
> سال مقرر ہیں۔ منطق، فلسفہ، ریاضی اور دیگر علوم عقلیہ تو گویا درس میں
> داخل ہی نہیں۔ اصول فقہ، تفسیر، حدیث، ادب و معانی و بیان کی تعلیم ہے
> لیکن اس قدر کم ہے کہ اتنے بڑے دار العلم کے کسی طرح شایان شان نہیں[1]"

ازہر کی یہ تصویر جو علامہ شبلیؒ نے کھینچی ہے وہ ۱۸۹۲ء کی ہے اور شیخ عبدہ
اس میں تقریباً بیس سال پہلے داخل ہوئے تھے۔ اس وقت یقیناً اس کا حال اس سے
بھی ابتر رہا ہوگا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس بحر ظلمات سے کبھی کوئی روشنی
کی کرن بھی نمودار ہوگی۔ عبدہ یہاں کی تعلیم ختم کرنے کے بعد جب زندگی کے میدان میں
داخل ہوئے تو وہ نہایت غیر مطمئن تھے وہ گاؤں میں پیدا ہوئے تھے ان سے وہاں کے

۱؎ مولانا سید سلیمان ندوی: حیات شبلی ص ۲۱۴۔

کسانوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ طنطا سے لے کر قاہرہ تک جن درسگاہوں میں ان کی
تعلیم ہوئی وہ ان سب سے بیحد مایوس اور بیزار تھے۔ شہروں میں عوام کی زندگی کو دیکھ کر
انھیں جو دکھ ہوتا تھا اس کے متعلق کبھی کبھی مصر کے اخبارات میں کچھ لکھ کر اپنے دل کا
بوجھ ہلکا کرتے۔

اتفاق سے اسی کرب و بے چینی کے عالم میں انھیں قاہرہ کی سرزمین میں افغانی
جیسا استاذ و مربی ملا۔ جو اپنے وطن سے سر پر کفن باندھ کر نکلا تھا اور جس نے یہ قسم کھائی
تھی کہ حق گوئی کی راہ میں وہ بڑی سے بڑی طاقت کو بھی حائل نہیں ہونے دیں گے چنانچہ
اسی جذبہ کے تحت وہ مصر آئے تھے۔ ان کا حوصلہ بہت بلند تھا انھوں نے مسلمانوں
کی اصلاح کا جو نقشہ بنایا تھا وہ اس وقت عجیب و غریب لگتا تھا لیکن بعد کے حالات
نے یہ ثابت کر دیا کہ دنیائے عرب اور دنیائے اسلام کے لیے یہی نقشہ مناسب تھا۔
اور اسی میں عربوں کی فلاح و بہبود تھی۔

مصر کی تاریخ میں افغانی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے حلقہ
میں تربیت پانے والے طلبہ کے ذہن میں وسعت و رواداری پیدا کی ان کو اپنے ماضی
کی تاریخ سے واقف اور حال و مستقبل کے خطرے سے آگاہ کیا، جو علم مدرسوں، مسجدوں،
خانقاہوں اور ذہنوں تک محدود رہے اس کو لاحاصل قرار دیا اور اس علم کی جانب
مصری علماء کی رہبری کی جس میں زندگی کی امنگیں اور عوام کی خدمت کرنے کا جوش
و ولولہ ہو ان کے خیال میں اسی طرح سے علماء کے ذہنوں کی کھڑکیاں کھلیں گی اور
ان کی زبان کی لکنت دور ہوگی اور ان کا قلم گھسے پٹے مضامین کے بجائے ان مسائل کی جانب
متوجہ ہوگا جن کی عوام کو ضرورت ہے۔ اس طرح افغانی نے اپنے شاگردوں کو

لکھنے پڑھنے اور زندگی سے متعلق مسائل کے بارے میں غور و خوض کرنے پر آمادہ کیا۔
اور یہ وہ مرحلہ ہے جہاں زبان و بیان قدیم بندشوں سے نکل کر ان طریقوں پر گامزن
ہوتے ہیں جو حالات کے مطابق ہوتے ہیں۔

شیخ عبدہ نے ازہر میں تعلیم کے دوران میں غیر درسی کتابوں کا مطالعہ بھی جاری
رکھا۔ چنانچہ تاریخ، فقہ، حدیث، ادب، معانی و بلاغت کی کتابوں کا انھوں نے
اچھا خاصہ مطالعہ کیا اور افغانی سے ربط و تعلق کے بعد غزالی، ابن تیمیہ، ابن قیم،
ابن رشد، ابو یوسف اور امام شافعیؒ کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ اس طرح وہ
مصر ہی نہیں پوری دنیائے عرب کے اپنے معاصر علماء کے درمیان ہر اعتبار سے
ممتاز ہو گئے اور جب ازہر، دارالعلوم مدرسة الالسن مدرسة القضا
جیسے اداروں میں وہ درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے تو ایک بڑے
کامیاب استاذ ثابت ہوئے اور ان کے درس و تدریس کے طریقہ کو ہر ادارہ میں
بیحد پسند کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ طلبہ کو صرف کتاب ہی نہیں پڑھاتے تھے
بلکہ ان کے اندر علم کا ایسا ذوق و شوق پیدا کرنے کی کوشش کرتے جس سے وہ
زندگی کے ہر میدان میں لوگوں کی خدمت کر سکیں اور انھیں تاریکی اور مایوسی کی دلدلوں
سے نکال کر روشنی اور امید کی شاہراہ پر کھڑا کر دیں۔

افغانی اور عبدہ نے جو روح پھونکی اس سے لوگوں کے اندر زندگی کا احساس
پیدا ہوا اور وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہونے لگے۔ چنانچہ عرابی پاشا کی قیادت
میں حکومت کے خلاف جو بغاوت ۱۸۸۲ء میں ہوئی وہ اگرچہ ناکام ہی تاہم اس کے
نتیجہ میں لوگ حالات سے باخبر اور دوست و دشمن کو جاننے لگے۔ شیخ عبدہ عرابی پاشا

کی انقلابی تحریک میں شامل تھے اس لیے جب انگریز مصر میں داخل ہوگئے اور حکومت کے اہم مرکزوں پر ان کا قبضہ ہوگیا تو شیخ عبدہ کو مصر سے جلاوطن کرکے بیروت بھیج دیا گیا۔

عبدہ کی جلاوطنی سے انگریز سمجھتے تھے کہ یہ انقلابی تحریک ختم ہوجائے گی مگر اس کے شعلے مصر کے علاوہ شام، عراق اور فلسطین میں بھی بھڑک اٹھے۔ اس زمانہ میں افغانی فرانس میں تھے وہیں انھیں اپنے عزیز شاگرد کی مصر سے جلاوطنی کی جب خبر ملی تو انھوں نے انہیں پیرس بلا لیا جہاں استاذ و شاگرد سر جوڑ کر بیٹھے اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی نئی راہوں کی تلاش میں لگ گئے اس کے نتیجہ میں ایک انقلابی مجلہ کے اجراء کا نقشہ سامنے آیا جس کا نام 'العروۃ الوثقیٰ' رکھا گیا۔

العروۃ الوثقیٰ کا اجرا

مجلۃ العروۃ الوثقیٰ پوری دنیائے اسلام کے لیے منارہ نور تھا اس کے مضامین کا تعلق صرف عربوں ہی سے نہیں ہوتا تھا بلکہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے لیے ان میں ہدایت و رہنمائی کا سامان ہوتا تھا اس زمانہ میں استعماری طاقتیں مصر اور ہندوستان پر اپنا پورا تسلط جما چکی تھیں اور مصر کے علاوہ دوسرے عرب ممالک دولت عثمانیہ کے زیر نگیں تھے انکے باشندے بھی ظلم و استبداد سے کراہ رہے تھے اسلیئے العروہ میں استعمار کی طرح اسلامی ملکوں کے سلاطین کے خلاف بھی مضامین شایع ہوتے تھے۔ افغانی اور عبدہ مسلمانوں کے جمود اور مایوسی کے خلاف بھی برسرپیکار رہتے اور مسلمانوں اور اسلام کے مخالفین نیز یورپ کے محققین و مصنفین کے زہر کا تریاق بھی مہیا کرتے تھے اس طرح یہ رسالہ سیاسی و ثقافتی بھی تھا اور اجتماعی و ادبی بھی تھا جس کی زبان اس وقت کے تمام عربی جرائد سے ہر اعتبار سے ممتاز اور مختلف

تھی۔ خود عبدہ کی جو تحریریں شایع ہوئی تھیں وہ ان کی دوسری تحریروں کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے زندہ و متحرک ہوتی تھیں۔

پیرس کی آزاد سرزمین اور آزاد فضا میں استاد و شاگرد بے خوف و خطر ہو کر اپنے دل کی آواز کو دنیا کے ہر گوشہ میں رہنے والے مسلمانوں تک پہونچا رہے تھے اور یہ رسالہ دنیائے عرب بلکہ دنیائے اسلام میں فصاحت و بلاغت، معانی و افکار کے اعتبار سے بالکل منفرد تھا۔ جو ہر انقلاب و ترقی پسند اور آزادی کے شیدائی کے لیے اگر باد نسیم تھا تو استعماری طاقتوں اور جمود پسند ذہنوں کے لیے باد سموم تھا۔ اس لیے استعماری طاقتوں سے رجعت پسند عناصر نے سمجھوتہ کرکے اس رسالہ کے خلاف محاذ آرائی کرلی۔ اور اس کے باہر جانے کے تمام راستوں کو مسدود کر دیا اس بنا پر اسے بند کرنا پڑا کیونکہ یہ جس مقصد کے لیے نکالا جا رہا تھا وہ مقصد پورا نہیں ہو رہا تھا اس رسالہ کے شمارے زیادہ نہیں نکلے[1]۔ لیکن اس کے باوجود اس کے اثرات نہایت دور رس نکلے اس نے عرب نوجوانوں کے ذہنوں کو بدل دیا اس کی وجہ سے لوگوں کے اندر تحریر و تقریر کا ملکہ پیدا ہوا۔

شیخ عبدہ کے اصول تعلیم

العروۃ کے بند ہونے کے بعد استاذ و شاگرد پھر الگ ہوگئے شیخ عبدہ نے دوسرے یورپی ملکوں کا دورہ کیا وہ خاص طور سے سوئزرلینڈ اور انگلستان گئے اور ان ملکوں کے طریقہ تعلیم، یونیورسٹیوں کے نظام، سائنس، ادب، صحافت اور تصنیف و تالیف کے اعلیٰ مراکز دیکھے۔ پھر ان آزاد ملکوں کے لوگوں کے امنگ و حوصلے اور سنجیدگی اور وقار کا بھی جائزہ لیا جسکی

[1] تقریباً ۱۸۔

وجہ سے ان کے ذہن میں جہاں وسعت پیدا ہوئی وہیں ان کے امنگ و حوصلہ میں بھی اضافہ ہوا اور جلا وطنی کے ایام کو انھوں نے اپنے اوپر بار نہیں سمجھا بلکہ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر نوجوانوں کو علم کی صحیح راہ اور زندگی کا صحیح مقصد بتانے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور یورپ سے پھر بیروت آکر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ انکا طریقہ افغانی سے کسی قدر مختلف تھا وہ سیاسی موضوعات کے بجائے علمی موضوعات پر زیادہ زور دیتے اور طلبہ کے اندر علم کا ذوق و شوق پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ کتابوں کی تدریس کے ساتھ ساتھ انھوں نے قرآن کی تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا اور قرآن کی تدریس کا یہ سلسلہ اس زمانہ کی تفسیروں سے بالکل مختلف تھا۔ قرآن کا براہ راست مطالعہ کرنے کا شوق انھوں نے اپنے طالبعلموں کے اندر پیدا کیا اور اس کی بلاغت کو سمجھنے کے لیے جو کتابیں معاون ہو سکتی تھیں ان کی طرف بھی انھوں نے ہونہار نوجوانوں کی رہبری کی۔ ان کے حلقہ کے ہونہار نوجوانوں میں شیخ رشید رضا، امیر شکیب ارسلان اور عبدالقادر المغربی کے نام قابل ذکر ہیں جو بعد میں شام کے آسمان علم و ادب پر زبان و بیان کے آفتاب و ماہتاب بن کر روشن ہوئے۔

اس عرصہ میں حالات نے کچھ کروٹ لی اور عبدہ کو اپنے وطن مصر آنے کی اجازت مل گئی۔ واپسی کے بعد انھوں نے اپنے تربیتی سلسلہ کو جاری رکھا اور وہاں کے ہونہار نوجوانوں کی تربیت اس طرح شروع کی کہ وہ کتابوں کی دنیا سے نکل کر زندگی کے میدان کو قطع کرنے لگے، ان کی کوششوں سے آہستہ آہستہ نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جو اپنے اپنے موضوع میں اچھی صلاحیت و استعداد

رکھنے کے علاوہ زبان و بیان کے بھی ماہر اور موجد ہو گئے تھے اور دیکھتے دیکھتے عربی نثر نگاری ماضی کی بندشوں کو توڑتی ہوئی اور فرسودہ مضامین سے اپنا دامن چھڑاتی ہوئی زندگی کی صحیح راہ پر اچھلتی کودتی اور مچلتی نظر آنے لگی۔ مصر میں عبدہ کی سرپرستی میں جن نوجوانوں نے آگے بڑھ کر وہاں کی ادبی و علمی قیادت کی انھوں نے عربی زبان و ادب کے قدیم سرمایہ سے پوری واقفیت حاصل کی تھی اور مغربی زبانوں میں کم از کم کسی ایک زبان میں بھی مہارت پیدا کی تھی۔ اس طرح کے نوجوانوں میں ڈاکٹر محمد حسین ہیکل، لطفی السید، قاسم امین قابل ذکر ہیں۔ اسی زمانہ یعنی انیسویں صدی کے آخر میں ایک مفکر عالم جن کی پیدائش شام کے مردم خیز شہر حلب میں ہوئی تھی۔ انھوں نے دولت عثمانیہ کے خلاف تحریک چلائی اور عربوں کو آزادی اور غلامی کا فرق بتانا شروع کیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ عثمانی امراء و حکام کی سازشوں کا شکار ہوئے اور ان کو وطن عزیز چھوڑ کر مصر میں پناہ لینی پڑی۔ اس طرح مصر انیسویں صدی کے خاتمہ تک بڑے ادیبوں، عالموں، محققوں اور اصحاب فن کا مرکز بن گیا۔

عبدہ کے بعد کا دور

اسی زمانہ میں عبدہ کے شاگرد خاص قاسم امین نے دو کتابیں لکھیں ایک تحریر المرأة، اور دوسری المرأة المسلمة عورتوں کے سلسلہ میں مسلمانوں نے اپنے دور انحطاط میں جو رویہ اختیار کیا ہے، اس کی وجہ سے عموماً یہ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ اسلام عورتوں کی آزادی، ان کے حقوق اور ان کی تعلیم و تربیت کا مخالف ہے۔ قاسم امین نے اپنی ان دونوں کتابوں میں ان غلط فہمیوں کو زائل کر کے اسلام کے صحیح موقف کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جس پر یہاں بحث و گفتگو مقصود نہیں ہے البتہ ان کتابوں کے طریقہ تعبیر و اسلوب کی طرف اشارہ کرنا چاہیں گے۔

دونوں کتابوں کے موضوع میں جدت ہے قاسم امین نے تصنیف و تالیف کے فن کو ایک نیا انداز اور نیا رخ دینے کے علاوہ نہایت ہی سنجیدہ اور شستہ بلکہ ادیبانہ زبان استعمال کی ہے اس کی وجہ سے عربی زبان جمود اور تقلیدی بندشوں سے آزاد ہو کر سیل رواں کی طرح امنڈنے لگی قاسم امین نے اور بھی بہت سے سیاسی اور سماجی موضوعات پر مضامین لکھے۔ اس طرح وہ ایک محقق اور کامیاب مصنف کے ساتھ ساتھ ایک ادیب اور صاحب فن کی حیثیت سے بھی منظر عام پر آئے، عباس محمود العقاد نے لکھا ہے کہ عام طور سے لوگ قاسم امین کو ایک اجتماعی مصلح اور کامیاب مصنف کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن وہ دراصل ایک غیر معمولی صاحب قلم اور ادیب تھے اس سلسلہ میں انھوں نے ان کی دو تقریروں کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ پہلی تقریر مصطفیٰ کامل کے انتقال پر کی گئی تھی اور دوسری تقریر ۱۹۰۸ء میں قاہرہ یونیورسٹی کے قیام کے منصوبہ کی تکمیل کے وقت کی ہے یہ یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ کے ممبران کے اجتماع میں انھوں نے کی تھی۔ یہ تقریر زبان و بیان کا اعلیٰ نمونہ اور تعلیم کے بنیادی مقاصد پر مشتمل ہے جو ممالک استعمار کی زد میں ہیں اور جہاں تعلیم اس لیے دلائی جاتی ہے کہ اس سے نوکریاں حاصل ہو جائیں اور طلبہ کو کارخانوں اور ملکوں میں بے جان پرزہ بنا دیا جائے۔ قاسم امین نے اپنی اس تقریر میں اس رجحان کی سخت مذمت کی ہے، ان کے نزدیک علم کا موضوع وسیع ہے، وہ زندگی کا جزو ہے اس سے زندگی روشن اور تابناک ہو جاتی ہے علم کے ذریعہ انسان انسان کو اور خود اپنے آپ کو پہچانتا ہے اس کی بدولت انسان اپنی حقیقت سے آگاہ ہو کر کائنات کے اسرار و رموز سے باخبر ہوتا ہے۔

اسی زمانہ میں کواکبی کی دو کتابیں طبائع الاستبداد اور ام القریٰ بھی منظر عام پر آئیں۔ ان میں انھوں نے ایک ماہر اجتماعیات و نفسیات کی حیثیت سے عوام کے ذہن و فکر کا جائزہ لیا ہے اور ان اسباب کی نشاندہی کی ہے جن سے لوگوں میں بزدلی، منافقت، مایوسی، جمود اور جھوٹ جیسی مہلک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ جو قوموں کو گھن کی طرح کھا جاتی ہیں۔ انھوں نے سب سے بڑا سبب ظلم و استبداد کو بتایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر رعایا پر حکام کی طرف سے ظلم ہو تو آہستہ آہستہ پوری قوم خوف و ہراس کی فضا میں سانس لیتے لیتے آزادی جیسی نعمت کے مزہ کو بھول جاتی ہے۔ اور جب آزادی کی نعمت سے کوئی قوم محروم ہو جائے تو وہ برے سے برے کام کر سکتی ہے اور اس کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ عربوں کے زوال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے اس بات کی وضاحت کی کہ جب تک عرب ممالک ظلم و استبداد سے نجات نہیں حاصل کریں گے وہ ترقی نہیں کر سکتے۔ دوسری کتاب ام القریٰ میں انھوں نے آزاد حکومت کے تصور کو پیش کیا ہے اور یہ کہ عربوں کی صحیح حکومت کیسے قائم ہو، اس کا مرکز کہاں ہو اور حکومت کا نہج و ڈھانچہ کیسا ہو۔ یہ کتاب مکالمہ کے انداز میں مرتب کی ہے ان دونوں کتابوں کا انداز عالمانہ اور ادیبانہ ہے۔

کواکبی اور قاسم امین کے بعد لطفی السید نے جن کو طویل عمر نصیب ہوئی اپنے خالص علمی اور فلسفیانہ انداز میں عربوں کی ذہن سازی کا بیڑا اٹھایا۔ اور تقریباً نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک وہ علمی و ادبی اور سماجی موضوعات پر مضامین لکھتے رہے۔ اور فرانسیسی زبان سے بہت سی اہم کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔

لطفی السید عربوں کو دنیاوی علوم سیکھنے کی تلقین بھی کرتے ہیں اور عربی میں ترقی یافتہ زبانوں سے اچھی کتابوں کا ترجمہ کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں تاکہ عام لوگ دنیا کے عالموں محققوں اور مصلحین کے افکار و خیالات سے واقف ہوں اور تصنیف و تالیف کا صحیح نہج ان کو معلوم ہو جائے۔ لطفی السید عبدہ کے شاگرد رشید تھے۔ ان کو عربی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور تھا۔ انھیں کی سرپرستی میں عقاد، طہٰ حسین، محمد حسین ہیکل نے اپنا علمی اور ادبی سفر شروع کیا۔

اس طرح بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے ختم ہوتے ہوتے عربی نثر ترقی کے اعلیٰ مرحلوں تک پہنچ گئی اور دینی موضوعات کے ساتھ سیاسی، سماجی، ادبی اور تنقیدی موضوعات پر لکھنے والے ہر جگہ نظر آنے لگے اسی کے ساتھ عربی صحافت بھی آگے بڑھی، جس میں عبدہ اور ان کے شاگردوں کا بڑا حصہ ہے۔ چنانچہ دوسرے دور کے ادیبوں میں لطفی السید، محمد حسین ہیکل، عباس محمود العقاد، ڈاکٹر طہٰ حسین، عبدالقادر مازنی، ڈاکٹر احمد امین اور احمد حسن زیات قابل ذکر ہیں۔ اس طرح عربی زبان مصر میں اعلیٰ سطح پر آگئی۔ ان ادیبوں کے انداز بیان میں اتنی جاذبیت اور کشش تھی کہ دوسرے عرب ممالک کے نوجوان ادیبوں نے بھی انھیں کی تقلید کی اور قدرت کی طرف سے ایسا انتظام ہوا کہ عربی زبان جو انیسویں صدی کی پانچویں دہائی تک موت و زندگی کے مرحلہ سے گذر رہی تھی اور اپنے ملک سے اس کا خاتمہ ہو رہا تھا اور اس میں غیر ملکی زبانوں کے اثرات تیزی سے بڑھ رہے تھے جس کی وجہ سے اس کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ غلط اور بگڑی ہوئی زبان کہیں اصل زبان نہ بن جائے اور ماضی سے اس کا رشتہ بالکل ٹوٹ نہ جائے۔ لیکن قدرت نے اس زبان کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے اور

ترقی کی راہ پر لانے کے لیے ان مفکرین و محققین کو پیدا کیا جن کی نظر عربوں کی تاریخ اور ماضی کے سرمایہ پر گہری تھی اور ان کو عربوں کی زبوں حالی کا احساس اور زبان کے انحطاط کا دکھ تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی کو اپنی زبان اور اپنی قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور ایک صدی بھی نہیں گذرنے پائی تھی کہ قرون اولیٰ سے بھی زیادہ عربی زبان ترقی یافتہ ہو گئی اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے طریقہ تعبیر و بیان میں تبدیلی آنے کے ساتھ ہی عصری مضامین کے لیے جو الفاظ و اصطلاحات درکار تھیں انکا بھی اس میں اضافہ ہوا اور عرب محققین و علماء کو غیر ملکی کتابوں کا ترجمہ کرنے میں کسی طرح کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ غرضیکہ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی تک پہونچتے پہونچتے یہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہونے لگی۔ اور مراکش سے بحر ہند کے ساحل تک عرب ملکوں کے عوام اور حکومت کی سرکاری زبان ہو گئی، اسکولوں، کالجوں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے ایک مشترکہ آسان زبان وجود میں آئی جو پورے علاقہ میں سمجھی اور پڑھی جاتی ہے۔

اس صدی کی پانچویں دہائی کے بعد جب عرب ملکوں میں پٹرول کی وجہ سے دولت کی فراوانی ہوئی تو اس کا اثر عربی زبان و ادب پر بھی گہرا پڑا۔ کتابوں کی نشر و اشاعت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ عربی صحافت کے ظاہر و باطن میں غیر معمولی بہتری پیدا ہوئی۔ غیر ملکی زبانوں سے سائنس، ٹکنالوجی، فلسفہ، سیاسیات کی اہم کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ جن کی عمدہ طباعت اور اچھے کاغذ کا خاص اہتمام ہوتا۔ زبان و ادب کے مسائل کے بارے میں عالمی سطح کے سیناروں اور علمی مذاکروں کا سلسلہ بھی تیزی سے بڑھا۔ سنہ ۱۹۵۰ء سے پہلے پوری دنیائے عرب میں تین بڑی علمی و ادبی اکیڈمیاں قاہرہ،

دمشق اور بغداد میں تھیں لیکن پانچویں دہائی کے ختم ہونے کے بعد دوسرے عرب ملکوں کی مرکزی جگہوں مثلاً مراکش، ریاض، عمان اور کویت میں اعلیٰ سطح کی علمی وادبی اکیڈمیاں قائم ہوئیں۔ ان اکیڈمیوں میں جہاں زبان وبیان کے مسائل پر سنجیدگی سے غور وخوض ہوتا وہیں عربی زبان کی قدیم کتابوں کو اچھی شکل میں منظر عام پر لانے کی کوشش کی جاتی۔ اس طرح عرب ممالک کے باہمی اتحاد اور زبان وبیان کے مسائل پر باہمی گفتگو سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا اور متفقہ طور پر عرب ملکوں کے علمی وادبی حلقوں میں یہ فیصلہ ہوا کہ زبان کی غلطیوں کو ہر طرح سے ٹھیک کیا جائے اور غیر مناسب الفاظ کی جگہ صحیح اور فصیح الفاظ کے استعمال کی ہدایت کی جائے۔ غیر ملکی زبانوں سے جو کتابیں عربی میں ترجمہ ہوتی ہیں ان کی زبان اور بیان کو زیادہ سے زیادہ عربی ذوق ومزاج کے مطابق کیا جائے۔ صحافت، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی زبان کو آسان سے آسان کیا جائے۔ اور زبان کے مسائل کو مقامی سیاست کے اثرات سے محفوظ رکھا جائے اور ہر مسئلہ پر خالص علمی اور سائنٹفک انداز میں غور وخوض کیا جائے اس طرح عربی نثر کا شاندار اور خوبصورت تسلسل باقی ہی نہیں رہا بلکہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا اور جن بنیادوں پر زبان کا ڈھانچہ مرتب ہوا تھا اس ڈھانچہ کو بہتر شکل میں مستحکم اور خوش نما بنایا گیا۔ نحو وصرف کی اہمیت کو باقی رکھتے ہوئے اس کی تدریس وتعلیم کے نئے طریقوں کو اپنایا گیا۔ اور ماہرین لسانیات کی نگرانی میں طلبہ کی عمر اور صلاحیت کے لحاظ سے کتابیں مرتب کی گئیں اور ثانوی مرحلہ سے لے کر اعلیٰ مرحلہ تک عربی زبان کو ادب وفن کی حیثیت سے نصاب میں داخل کیا گیا۔ جس کی بدولت عربی زبان زوال وانحطاط سے محفوظ ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی

مختلف اوقات میں پیدا ہونے والے علاقائی رجحانات بھی خود بخود ختم ہوگئے اور عربی نثر کا معیار دور جدید کے ادیبوں اور انشا پردازوں کی کوششوں سے بہتر ہوتا گیا یہی وجہ ہے کہ آج تقریباً ہر ملک میں عربی نثر کی سطح یکساں ہوگئی اور ہر علاقہ کے ادیبوں کی پیہم کوشش ہے کہ زبان کے ظاہر وباطن کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی سطح پر لایا جائے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

احمد امین، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، احمد حسن زیات، محمود تیمور، عبد القادر مازنی، عباس محمود العقاد، خلیل مردم بک، علی الطنطاوی، سید قطب اور مولانا ابو الحسن علی ندوی کی تحریریں اپنے وقار اور سنجیدگی اور فکر کی بلندی کی بدولت دنیا کی اعلیٰ زبانوں کی نثر سے کسی اعتبار سے کم نہیں ہیں۔ اس طرح مختلف جگہوں کے ادیبوں کی پیہم کوششوں ہی کے نتیجہ میں عربی نثر کا معیار اتنا اونچا ہوگیا کہ اس زبان کے ایک ممتاز صاحب فن نجیب محفوظ کو ادب کا سب اعلیٰ انعام NOBLE PRIZE سنہ ۱۹۸۸ء میں ملا۔ جس سے عربی زبان کی اہمیت اور اس کی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے۔

خواجہ حافظ شیرازی کی شاعری میں تصوف

از

ڈاکٹر سید وحید اشرف کچھوچھوی پروفیسر و صدر شعبۂ عربی فارسی اردو، مدراس یونیورسٹی

صوفیہ کہتے ہیں کہ جب قلب مصفیٰ ہو جاتا ہے تو یہ تجلیات ربانی کی جلوہ گاہ بن جاتا ہے، اس وقت قلب کا تعلق اپنے رب سے بلا واسطہ ہو جاتا ہے اور قرآن کی اس آیت کے بمصداق سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ، وہ ربانی نشانیوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (م ۷۸۲ھ) شرح آداب المریدین میں لکھتے ہیں:-

معنی فہم کردن از خداوند تعالیٰ آن بود که بسر صافی خویش از خداوند عز و جل بی واسطہ مستفید شود (ص ۲۰۰)

خدائے تعالیٰ سے فہم حاصل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ بندے کا مصفیٰ باطن خداوند عز و جل سے بے واسطہ مستفید ہوتا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

آبادان کردن باطن و آن تبدیل صفات مذمومات بمحمودات بود و بجای آوردن احوال و نگاہ داشتن اسرار بود که خاص از سرہا چیزی دھند که عام از آن محروم

باطن کو آباد کرنے کا مطلب ہے بری صفات کو اچھی صفات سے بدلنا اور احوال کو درست کرنا اور اسرار کو پوشیدہ رکھنا کہ خواص کو اسرار میں سے کچھ ایسی چیزیں

باشند، اگر نہ چنین بود فائدۂ خصوصیت چہ باشد؟ (ص ۲۳۴)

ملتی ہیں کہ عام لوگ (یعنی علمائے ظاہر) اس سے محروم رہتے ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو خاص و عام میں امتیاز کی ضرورت ہی کیا ہوتی۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:-

عالم از شنیدہ خبر میدہد و عارف از دیدہ

عالم سنکر (یا پڑھکر) خبر دیتا ہے اور عارف دیکھ کر خبر دیتا ہے۔

رب سے عارف کے قلب کا یہ بالواسطہ ربط صوفیہ کے ذاتی احوال ہیں۔ جب صوفی صوفیانہ تعلیمات کو دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے تو اکثر اس میں اس کے ذاتی احوال بھی شامل ہوتے ہیں لیکن ذاتی احوال ہونے کے باوجود صوفیہ اپنی تعلیمات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ عام لوگوں پر افشائے حال نہ ہو سکے۔ ذاتی احوال کو صوفیہ اپنا راز کہتے ہیں جو ان کے باطن میں ہوتا ہے۔ اور جو عبد و معبود کے درمیان ہوتا ہے، ان کے لیے باطن میں بھی آیات الٰہی ہوتی ہیں۔ صوفیہ کی تعلیمات میں ان کو پوشیدہ رکھنا ضروری ہے۔ اگر بلا قصد کچھ افشائے حال ہو جائے تو ایسی صورت میں وہ مجبور سمجھا جائے گا۔ البتہ بعض صوفیہ نے کبھی قصداً اپنا افشائے حال کیا ہے، یہ بھی ان کے مخصوص حالات کے تابع ہے۔ اس تمہید کا مقصد یہاں صوفیہ کے ایک ضروری اصول کا بیان کرنا تھا جسے اسرار صوفیہ کہتے ہیں اور جو ہمارے اس مضمون سے مربوط ہے اس کی عقلی اور تشریحی توجیہات کو بیان کرنا ہمارے مقصد سے باہر ہے۔

دوسروں کو تعلیم دینے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ عام لوگوں پر افشائے حال

نہ ہوسکے اور صرف صاحب ذوق لوگ استفادہ کر سکیں لیکن صوفیہ کو اپنی تعلیمات پیش کرنے میں ہر وقت افشائے حال کا خطرہ بھی رہتا ہے۔ ان حالات میں اپنی تعلیمات کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا سخت مشکل ہے، اس بیان کی تشریح و توضیح میں طوالت ہے اس لیے اس پر ہم پھر کبھی وضاحت سے لکھیں گے۔ یہاں کہنا یہ ہے کہ اس درپیش مشکل کو حل کرنے کے لیے صوفیہ نے کچھ مخصوص طریقے اختیار کیے ہیں۔ ایک طریقۂ تعلیم یہ ہے جس میں صوفیہ صرف اصولوں سے بحث کرتے ہیں۔ اس میں کوشش کرتے ہیں کہ اپنے ذاتی احوال اور روحانی تجربات کا ذکر نہ آنے پائے۔ وہ طریقت کی باتوں کو عقل و شرع کی روشنی میں سمجھاتے ہیں۔ اس طرح کی کتابوں میں جو فارسی زبان میں ہیں چند یہ ہیں۔ امام غزالیؒ کی کیمیائے سعادت، سید علی ہجویریؒ کی کشف المحجوب، سعدیؒ کی بوستاں، سید اشرف جہانگیرؒ کی لطائف اشرفی[1] اور قطب و بلورؒ کی جواہر السلوک وغیرہ۔ لیکن شرح و بیان میں کلیۃً اپنے احوال سے صوفیہ کا بے نیاز رہنا سخت مشکل ہے چنانچہ ایسے مواقع بھی آتے ہیں جہاں خود انھیں اپنے تجربہ کی روشنی میں بات کہنی پڑتی ہے۔ دوسرے تصوف کے مسائل اور روحانی اعمال کے نتائج کو بیان کرنے میں ذاتی احوال کے اظہار کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے اس لیے اپنی شخصیت اور احوال پر پردہ ڈالنے کے لیے صوفیہ نے چند تدبیریں اختیار کی ہیں۔ ایک تو شعر کی زبان میں اس طرح اظہار کہ عام لوگوں پر افشائے حال نہ ہوسکے اور خاص لوگ مقصود کو پالیں یہ طریقہ

---

[1] لطائف اشرفی میں سید اشرف جہانگیرؒ کی کرامات کا جو ذکر ہے وہ حضرت جہانگیرؒ کے ملفوظات نہیں ہیں بلکہ جامع لطائف نے اپنے چشم دید مشاہدات کو خود بیان کردیا ہے بعض کرامات کو سنکر بھی بیان کیا ہے۔

حافظ کے اشعار میں زیادہ ملتا ہے۔ دوسرے، صوفیہ کے وہ جامع اقوال ہیں جو ان کے ذاتی تجربات اور پختہ شعور پر دلالت کرتے ہیں لیکن جن کا ادراک صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو راہ طریقت سے آشنا ہیں۔ اس طرح کے اقوال صوفیہ کی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے کبھی کبھی علمائے ظاہر صوفیہ کی مخالفت پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ تیسرا طریقہ حکایات و تمثیلات اور لطائف و ظرائف کے پیرایہ میں تصوف کی تعلیمات اور حقائق کو پیش کرنا ہے۔

خواجہ حافظ نے صوفیانہ تعلیمات کو پیش کرنے کے لیے شعر کی زبان اختیار کی اور چونکہ انھیں بوستاں کی طرح بیانیہ شاعری نہیں کرنی تھی بلکہ ایسی شاعری مقصود تھی جس سے افشائے حال کا خطرہ زیادہ تھا اس لیے انھوں نے ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا جس سے صرف خواص استفادہ کر سکیں اور ایسی زبان استعمال کی جو حقیقت و مجاز دونوں کی متحمل ہے تاکہ جو حقیقی معنی مراد لینا چاہیں، ان کے لیے بھی اس میں گنجائش رہے اور جو صرف مجازی معنی ہی کو اختیار کریں ان کے لیے بھی کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ شعر حافظ میں مجازی معنی میں بھی جو لطف سخن ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن بالکل اسی طرح بیان کا ایک پہلو حقیقی بھی ہے۔ اس لیے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس حقیقی مراد سے دوسرے کو باز رکھے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

یہ صحیح ہے کہ حافظ نے ایسے اشعار بھی کہے ہیں جو صرف روایت کی تقلید میں ہیں، صوفیہ کے اصول کے مطابق یہ چیز بھی متحسن ہے کہ آدمی جس زمرہ سے تعلق رکھتا ہو، شرع کی پابندی کی شرط کے ساتھ اپنے کو اس زمرہ سے ممتاز نہ کرے۔ مثلاً ایک صوفی سپاہی ہے تو وہ اپنے سپاہیانہ لباس کو کلیۃً ترک نہ کردے۔ البتہ لباس

شرعی حدود میں ہونا چاہیے۔ اسی طرح دوسرے امور میں قیاس کرسکتے ہیں خرقہ پہننا
صرف اس کے لیے جائز قرار دیا گیا ہے جو اس کی ان شرائط کو پوری کرتا ہو جن کی تفصیل
صوفیہ کی کتابوں میں بیان کی گئی ہیں۔ اب اگر کوئی صوفی شاعر بھی ہے تو اس کے لیے
شاعری میں ان روایات کی پابندی کرنا بہتر ہے جن کے پابند اس زمانے کے عام شعراء
ہوں یعنی کلام سے یہ محسوس ہو کہ جذبات میں، احساسات میں، ضروریات میں، معاشرت
اور سماجی زندگی میں وہ عام انسانوں سے الگ نہیں ہے تاکہ اس کی طرف سے خود بینی
خود پرستی یا مدعیانہ انانیت کے بجائے یہ معلوم ہوسکے کہ وہ ایک متواضع اور متوازن انسان ہے۔
یہی وجہ ہے کہ حافظ عام لوگوں میں عام لوگوں کی طرح نظر آتے ہیں لیکن جو حقیقی ذوق
رکھتے ہیں وہ حافظ کے اصل مقصود کو پالیتے ہیں۔ حافظ کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ
عام لوگوں سے مخفی رہیں۔ عوام مجاز میں مشغول رہ کر شعر سے لطف اندوز ہوں گے
اور خواص تصوف کی روحانی تعلیمات سے بہرہ مند ہوسکیں گے۔

صوفیہ کی تعلیمات جو عام طور سے بڑے بڑے صوفیہ کی تحریروں اور ان کی
زندگیوں میں ملتی ہیں وہ سب حافظ کے اشعار میں بھی موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ
اہم اور بنیادی تعلیمات ان کے اشعار کی روشنی میں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

تصوف کی اساس عشق الٰہی اور عشق رسول ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم
ہیں۔ صوفیہ کے یہاں ارادت و بیعت کے مقاصد گوناگوں ہیں مگر اہم المقاصد
یہی عشق ہے۔ مرشد کی محبت کے ذریعہ اسے عشق رسولؐ کی دولت حاصل ہوتی
ہے اور عشق رسولؐ سے عشق الٰہی کی منزل میں پہنچتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ مقصود
یوں بیان کیا گیا ہے۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ (جو لوگ ایمان لائے وہ

اللہ سے اشد درجہ محبت رکھتے ہیں) اور شدت محبت کا نام عشق ہے۔

صوفیہ نے اعمال کے ساتھ عشق اور دل کے سوز و گداز کو بہت اہمیت دی
ہے۔ عمل کی قدر و قیمت دل کی حالت پر موقوف ہے اور یہ حالت سوز و گداز کا نتیجہ
ہے۔ مولانا روم کہتے ہیں۔

سوز باید سوز با این سوز ساز

حضرت نظام الدین اولیاء کے مریدوں میں امیر خسرو سے بڑھ کر ریاضت و مجاہدہ
کرنے والے لوگ تھے لیکن انھوں نے سب سے زیادہ فخر امیر خسرو پر کیا ہے۔ اس کا
سبب صرف یہی ہے کہ سنت کی پیروی کے ساتھ امیر خسرو کو وہ سوز قلب حاصل
تھا جس پر بہت سی ریاضتیں قربان کی جاسکتی ہیں۔

الغرض سبھی صوفیہ کی تعلیمات میں عشق و محبت کی تعلیم بنیادی حیثیت رکھتی
ہے۔ اور تصوف کی اساس ہی عشق اور حب الٰہی ہے، صوفیہ خدا کی عبادت اسکی
محبت میں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جنت و دوزخ سے بھی بے نیاز ہوجاتے ہیں،
ان کی عبادت اور ان کی زندگی کا مقصود صرف رضائے الٰہی ہوتا ہے۔ حافظ نے
اسے جس طرح پیش کیا ہے وہ ان اشعار سے ظاہر ہوگا جن کا منظوم اردو ترجمہ
بھی درج ہے۔

تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن
کہ دوست خود روش بندہ پروری داند

نہ اپنی بندگی کو تم کرو مشروط اجرت سے
کہ معبود حقیقی سب سے بڑھ کر بندہ پرور ہے

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد ازو غیر ازو تمنائی

ہو خدا سے اسکی رضا طلب، نہ ہو شوق وصل و فراق اب
کہ ہو تم کو دعوی عشق جب تو ہو چاہ غیر کی؟ بلعجب

حافظا لطفِ حق اربا تو عنایت دارد　　تم پہ جب لطف کا فیضان ہوا ہے حافظ
باش فارغ زغمِ دوزخ و شادیِ بہشت　　پھر تمہیں جنت و دوزخ سے سروکار ہے کیا
خرد ہر چند نقد کائنات است　　عقل ہے نقد کائنات، مگر
چہ سنجد پیش عشق کیمیا کار　　عشق کے سامنے فروتر ہے

صوفیہ کے نزدیک خدا سے محبت کی ایک دلیل خدا کی مخلوق سے محبت بھی ہے اگرچہ امام غزالی، ابن عربی اور مولانا روم نے اسکی عقلی توجیہ بھی کی ہے یعنی یہ کہ وجود صرف خدا کا ہے اور یہ کائنات صرف اس کی صفات کے مظاہر ہیں اس لیے کائنات کی ہر شئے میں اسی کا وجود ہے اس لیے خدا سے محبت کا مطلب ہی یہ ہے کہ خدا کی مخلوق سے بھی محبت ہو۔ لیکن حافظ کے یہاں یہ فلسفیانہ ادھیڑ بن نہیں ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ جن کو وجود کی معرفت ہو گی ان کا عمل زیادہ قابل قدر اور یقین کامل کے ساتھ ہو گا لیکن یہ مسئلہ پیچیدہ اور عام لوگوں کی فہم سے باہر ہے اس لیے اس کے متحمل صرف خواص ہی ہو سکتے ہیں لیکن یہ تعلیم یعنی مخلوق سے محبت، صرف خواص کے لیے نہیں ہے دراصل دنیا کے امن اور خوشحالی کے لیے ضروری ہے کہ مخلوق سے محبت کی جائے حافظ نے بجائے فلسفہ پیش کرنے کے، دلکش انداز میں مخلوق سے محبت کی تعلیم دی ہے جو کسی فلسفیانہ موشگافی کے بغیر براہ راست دل میں اتر جاتی ہے اور یہی تو شاعر کا کمال ہے،

مباش در پی آزار و ہر چہ خواہی کن　　اور جو چاہو کرو دل کے دکھانے کے سوا
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہی نیست　　میرے مذہب میں نہیں اس سے بڑا کوئی گناہ
آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است　　راحتِ ہر دو جہاں معنی دو لفظ میں ہے

با دوستان تلطف با دشمنان مدارا　　لطف یاروں سے تو دشمن سے مدارا بھی ہے
چناں بزی کہ اگر خاک رہ شوی کس را　　رہ حیات میں گر خاکِ راہ بن جاؤ
غبار خاطری از رہ گذار ما نرسد　　خیال رکھو کہ دل پر کسی کے گرد نہ آئے
درخت دوستی بنشاں کہ کام دل بہ بار آرد　　لگاؤ دوستی کا نخل جو بر لائے امیدیں
نہال دشمنی برکن کہ رنج بیشمار آرد　　اکھاڑو دشمنی کا پیڑ جو ہیں غم کی بنیادیں
ہر آنکس کہ او فتاد خدایش گرفت دست　　جس کا والی کوئی نہیں ہے اسکا مولا والی ہے
پس بر تو باد تا غم افتادگان خوری　　بیچاروں کا جو والی ہے اس سے مولا راضی ہے
یک حرف صوفیانہ بگویم اجازت است؟　　اک بات صوفیانہ کہوں، گر اجازت ہو
ای نور دیدہ صلح بہ از جنگ و داوری　　اے نورِ دیدہ جنگ سے بہتر ہے آشتی
بسیار خفتہ اند درین خاک سیم تن　　بہت سے سیم تن اس خاک کے نیچے ہیں آسودہ
شاہان و از عروس بسی از جہان جدا　　حسینانِ جہاں ہوں وہ کہ ہو کوئی شہ والا
ہشدار پای بر سر این مردگان منہ　(ق)　نہ رکھو پاؤں ان پر یہ بڑے نازوں کے پالے تھے
تنہا بخاک خفتہ و از خانماں جدا　　نکل کر اپنے گھر سے، خاک کے نیچے ہیں خوابیدہ

یہ کہا جا چکا ہے کہ صوفیہ کے نزدیک اصل میں دل کی قیمت ہے۔ ایک حدیث قدسی ہے جس کا ترجمہ مولانا روم نے یوں کیا ہے۔

ما دروں را بنگریم و حال را　　ما بروں را ننگریم و قال را

یہ دل سوز و گداز کا طالب ہے۔ اس کے بغیر عمل کا مرتبہ بلند نہیں ہوتا اور آدمی طریقت کے لائق ہی نہیں رہتا۔ لیکن سوز و گداز پیدا نہیں ہو سکتا اگر دل اخلاص سے خالی ہو۔ اخلاص کے بغیر دل ریاکاری میں مبتلا ہوگا اور صوفیہ کے نزدیک ریاکاری شرک ہے

جو سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس لیے حافظ نے جگہ جگہ ریا کی مذمت کی ہے اور صدق و اخلاص کی تعلیم دی ہے۔

بصدق کوش کہ خورشید زاید از نفست
ہے نفس طالعِ خورشید بصدق

کہ از دروغ سیہ گشت روح صبح نخست
صبحِ کاذب کا منہ سیاہ ہوا

خلقی زبان بدعوی عشقش کشادہ اند
یہ دیکھو، عشق کا دعویٰ بہت سے لوگ کرتے ہیں

ای من غلام آنکہ دلش با زبان یکی ست
زبان و دل ہو جسکا ایک میں دیوانہ اسکا ہوں

بر درِ میخانہ رفتن کار یکرنگان بود
میخانے کے در کا اہل وہ ہے یکرنگ جو ہوتا ہے حافظ

خود فروشان را بکوی میفروشان راہ نیست
جو لوگ ہیں محو خود بینی اس دولت سے محروم وہ ہیں

غلامِ ہمتِ دردی کشانِ یکرنگم
حافظ ہے غلامِ صاحبدل یکرنگ جو دیکھا بھالا ہے

نہ از گروہ کہ ازرق لباس و دل سیہ اند
ان میں سے نہیں جو ہیں بیدل ہے خرقہ تن دل کالا ہے

خدا زان خرقہ بیزار است صد بار
اللہ کو ایسے خرقہ سے اک نفرت کیا صد نفرت ہے

کہ صد بُت باشدش در آستینی
ہو جسکی اک آستیں میں سو سو بت پنہاں اے حافظ

مخلوق سے محبت، خدا سے عشق، عبادت میں اخلاص اور دل کے سوز و گداز کے ساتھ مقام بندگی کو پہچاننا ایک سالک کے لیے ضروری ہے۔ جوں جوں دل مصفیٰ ہوتا جاتا ہے سالک کو مختلف رنگوں اور شکلوں میں تجلیات ربانی کا مشاہدہ ہوتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں سالک کے گمراہ ہونے کا سخت خطرہ ہے، یہاں اسے ایک تجربہ کار مرشد روحانی کی ضرورت ہے تاکہ اسے پندار اور نفس و شیطان کے دھوکے سے بچائے۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں:-

دور است سر آب درین بادیہ ہشدار
ہوشیار رہو اس وادی میں ہے دور سر آب اے حافظ

تا غول بیابان نفریبد بسراب
جو غول بیاباں راہیں ہیں دکھلاتے سراب ہیں آنکھوں کو

بندگی کا مطلب ہے کہ خدا کے وجود کے سامنے اپنے کو ہیچ سمجھے۔ دراصل خدا کی شان اور اس کی کبریائی کے لایق عبادت کرنا کہ اس کا حق ادا ہو جائے ناممکن ہے اگر عابد و زاہد اپنی اس کمزوری کو سامنے رکھے کہ وہ مالک کی اطاعت اس کے حکم کے ٹھیک ٹھیک مطابق کرنے سے عاجز ہے تو اسے ہمیشہ اپنی عاجزی کا احساس رہیگا اور یہی احساس اس کی روحانی ترقی کا زینہ ہے۔ وہ اپنے عمل کو دوسروں سے بہتر کیسے سمجھ سکتا ہے جبکہ نجات صرف خدا کے فضل پر موقوف ہے۔ حافظ نے اپنے اشعار میں جگہ جگہ مقام بندگی سے آگاہ کیا ہے اور تواضع و خاکساری کی تعلیم دی ہے

تا فضل و عقل بینی بے معرفت نشینی
وہی بے معرفت ہے خود کو جو با فضل کہتا ہے

یک نکتہ ای بگویم خود را مبین کہ رستی
نہ دیکھو ہستیِ خود کو یہ نکتہ اصل عرفاں ہے

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
عاشق و معشوق کے بیچ میں حائل ہے تو

تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز
خود کو اٹھا بیچ سے، حافظ پردہ ہے تو

در کوی عشق شوکتِ شاہی نمی خرند
عشق کے کوچے میں ہے شوکتِ شاہی حقیر

اقرار بندگی کن دعوای چاکری
بندگی و عشق میں ہے نہاں عاشق کی شان

بگذر ز کبر و ناز کہ دیدہ است روزگار
زمانے نے بہت دیکھے ہیں کبر و ناز کے تیور

چین قبای قیصر و طرف کلاہ کی
نہ کر تقلیدِ فغفور و جم و کیخسرو و قیصر

نصیب ماست بہشت ای خداشناس برو
ہے بندگی کیا شے اسے کیا مدعی سمجھے

کہ مستحق کرامت گناہگاران اند
احساسِ ندامت سببِ عفو و کرم ہے

یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ صوفی خدا کی عبادت صرف اس کی محبت اور اس کی

رضا کے حصول کے لیے کرتا ہے۔ جب مقصد محبت الٰہی اور رضائے الٰہی ٹھہرا تو یہی اس کی زندگی کا مقصود بھی قرار پایا۔ وہ ترقی کرتے کرتے اپنے محبوب کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ دل و دماغ پر اس کے محبوب کی یاد چھا جاتی ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی غفلت کو وہ گوارا نہیں کرتا بلکہ اسے سب سے بڑا خسران سمجھتا ہے۔ وہ تمام دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ خدا کی یاد ہی اس کا سرمایۂ حیات اور مقصود حیات بن جاتا ہے۔ حافظ کہتے ہیں:۔

حضوری گر ہمی خواہی از و غائب مشو حافظؔ
حضوری کی ہے گر خواہش نہ بھول اسکو کبھی حافظؔ

متی ما تلق من تھویٰ دع الدنیا و اھملھا
جو ہے مطلوب دیدارِ خدا تو ترک دنیا کر

مردم دیدۂ ما جز برخت ناظر نیست
میری آنکھیں ترے دیدار میں ہر دم فانی

دل سرگشتۂ ما غیر ترا ذاکر نیست
دل مرا یاد میں تیری ہے ہمیشہ ذاکر

لیکن دنیا سے بے نیازی اور ترک دنیا کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ آدمی مخلوق کے دکھ درد کے احساس سے عاری ہو جائے۔ جب مخلوق سے محبت تصوف کی اولین تعلیمات میں سے ہے تو صوفی مخلوق سے بے پروا کس طرح ہو سکتا ہے دنیا کی بہتری اور لوگوں کی خوشحالی کے لیے جد و جہد کرنا، دوسروں کے دکھ درد کو دور کرنے کی کوشش کرنا، کاہلی اور بے عملی سے دور رہنا، انسانیت کی بقا اور عروج کے لیے ہمیشہ مصروف عمل رہنا، اپنی روزی محنت کرکے حاصل کرنا اور بلند مقاصد کے حصول کے لیے جذبۂ عشق کے ساتھ راہ عمل پر گامزن رہنا، وہ تعلیمات ہیں جو ہمیں حافظؔ کے اشعار میں نہایت موثر انداز میں پوری فنی مہارت کے ساتھ ملتی ہیں جنکی شعری جاذبیت سے اگر دل جھوم اٹھتا ہے تو ان کی گرمی رگوں

میں خون بنکر دوڑنے لگتی ہے ملاحظہ ہو۔

چرخ برہم زنم ار غیر مرادم گردد
ہو مرے مقصد سے باہر تو تبہ کردوں اسے

من نہ آنم کہ زبونی کشم از چرخ فلک
میں زبونی کیسے دیکھوں گردش افلاک سے

وقت را غنیمت دان آن قدر کہ بتوانی
ایک اک لمحہ کی تم قدر کرو تا امکاں

حاصل از حیات ای جان یکدم است تا دانی
ایک لمحہ کو بھی تم حاصلِ دنیا جانو

تاج شاہی طلبی گوہر ذاتی بنما
تاج شاہی چاہتے ہو گوہرِ ذاتی دکھاؤ

ور خود از گوہر جمشید و فریدون باشی
خواہ تم جمشید و کیخسرو کے وارث کیوں نہ ہو

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجان
ہے خطرہ جان کا اس رہ میں جو لیلیٰ کو جاتی ہے

شرط اول قدم آنست کہ مجنون باشی
جو رکھنا ہے قدم اس راہ میں مجنوں کا دم رکھو

کاروان رفت و تو در خواب و بیابان در پیش
ہے کارواں نظر سے گم، مگر ہو مست خواب تم نہ ہے کوئی نشانِ سُم

کی روی، رہ ز کہ پرسی، چہ کنی، چوں باشی
اٹھاؤ گے بھی تم قدم یہ بہر کا کیوں ہے غم ہو کیوں اسیر کیف و کم

ترسم ازین چمن نبری آستین گل
مجھے یہ ڈر ہے کہ محروم گل نہ ہو جاؤ

کز گلشنش تحمل خاری نمیکنی
تمہارے دل میں اگر زخم خار کا ڈر ہے

تکیہ بر جای بزرگان نتوان زد بگزاف
بڑائی کے لیے اسلاف کا کب تک یہ چرچا ہو

مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی
کرو کچھ فکر اسباب بزرگی، دیکھو خود کیا ہو

خزینہ داری میراث خوارگان کفر است
خزینہ داریِ میراث خوارگاں ہے کفر

بقول مطرب و ساقی بفتوی دف و نی
بقول مطرب و ساقی بفتوی دف و نے

دہقان سالخوردہ چہ خوش گفت با پسر
کیا خوب نصیحت بیٹے کو دہقانِ دانا نے دی تھی

کای نور چشم من بجز از کشتہ ندروی
اے نور نظر، اے لخت جگر، جو بوؤ گے سو کاٹو گے

آدم خاکی بدین عالم نمی آید بدست — انسان کوئی خاک کا پتلا نہیں ملتا

عالم دیگر باید ساخت از نو آدمی — اب آدم نو سے نئی اک دنیا بنائیں

کاروان رفت و تو در خواب و بیابان در پیش — چلا گیا ہے کارواں مگر تو مستِ خواب ہے بیاباں ہے کمیں گاہ

وہ کہ بس بے خبر از غلغل بانگ جرسی — تو مستِ غفلت و گمان کہ نشہ شراب ہے جرس کا غل ہے اور ریگاں

عمل و جدوجہد کے باوجود مسائل حیات تمام کے تمام حل نہیں ہو جاتے زندگی کی گتھیاں اور اس کے پر پیچ عقدے کارزار حیات میں تنازع للبقا کی طرح اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ انسان گویا حیوان سے بھی بدتر بن جاتا ہے۔ انواع حیوانات میں بعض ہی ایسے ہوں گے جو خود اپنی ہی نوع کو ختم کرنے پر آمادہ ہوں۔ کبوتر اور کوے بھی ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ انسان اگرچہ سماجی حیوان ہے لیکن وہ خود اپنے ہی سماج کو تباہ کرنے پر بھی آمادہ رہتا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کی زندگی سے چین و سکون، راحت و آرام چھین لیتی ہیں۔ صوفیہ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ حالات کے سامنے سپر انداز ہونے کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کے پاس کشاکش حیات سے نبرد آزما ہونے کے لیے کوئی نسخہ نہیں ہے۔ توکل اور گوشہ نشینی کی کیسی ہی خوش کن باتیں کیوں نہ ہوں، دنیا کے حالات آپ سے آپ تو سدھر نہیں سکتے؟ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مخالف قوتوں سے ٹکر لی اور جارحانہ نہ سہی مدافعانہ عمل کے ذریعہ شر کو زیر کر دیا اور خیر کی قوتوں کو غالب کر دیا۔

لیکن حافظ نے اور بیشتر صوفیہ نے بھی افراد سازی پر زور دیا ہے۔ افراد سے جماعت بنتی ہے اور جماعت سے معاشرہ۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ عمل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلے افراد سازی کی۔ اس سے جماعت تیار ہوئی۔ جماعت سے ایک صالح ترین معاشرہ وجود میں آیا۔ اس صالح معاشرہ کے بقا اور تسلسل کی ذمہ داری

صاحبان اقتدار اور ارباب صلاح دونوں پر تھی۔ کیونکہ خلافت راشدہ کے بعد خلافت و امامت کبھی ایک شخصیت میں جمع نہ ہو سکی۔ اس لیے لوگوں کے اخلاق کی اصلاح اور دینی تبلیغ کی ذمہ داری صرف علماء اور صوفیہ نے قبول کی۔ ایران میں حافظ کا دور معاشرہ کی ابتری کا دور تھا۔ اس وقت کوئی ایسا معاشرہ وہاں تھا ہی نہیں جو شر کی مدافعت کے لیے آمادہ ہو سکے۔ حافظ نے افراد سازی پر زور دیا جس کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ حافظ نے فرد کو جو تعلیمات دی ہیں وہ محض عارضی نہیں ہیں بلکہ ان میں دائمی حقیقت ہے۔ لیکن یہ سوال ہمیشہ، اچھے اور برے دونوں قسم کے حالات میں قائم رہتا ہے کہ آدمی کو قلبی راحت اور ذہنی سکون کس طرح میسر ہو سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ عیش و راحت کی زندگی میں لوگوں کو قلبی سکون بھی میسر ہو۔ اس کا زندہ ثبوت محمد اسد (سابق لیوپولڈ) کی کتاب روڈ ٹو مکہ (Road to Mecca) میں ملے گا جس میں اس نے خود اعتراف کیا ہے کہ یورپ میں دولت کی فراوانی کے باوجود لوگوں کو قلبی سکون نہیں حاصل ہے اور اس کا سبب اسے قرآن مجید کی سورۂ تکاثر میں ملا۔ یہ واقعہ ہے کہ جب دنیا انتشار اور خون خرابہ میں مبتلا ہو تو ایسی صورت میں اطمینان قلب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر آدمی جنگ و امن، تنگی و فراوانی، تکلیف و آرام، مرض و صحت اور زندگی کے تمام احوال میں اطمینان قلب حاصل کرے تو یہ دنیا کی سب سے بڑی دولت ہوگی اور اصل دولت تو آخرت کی دولت ہے پس جسے یہاں واقعی اطمینان قلب نصیب ہو جائے تو یہ قرآن کی اس آیت کے مصداق آخرت کی دولت کی بھی علامت ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ اس سے پتہ چلا کہ یہ اطمینان قلب اس دنیا کی بھی زندگی کا ایک مقصود ہے حافظ نے دنیا میں اطمینان قلب حاصل کرنے کا نسخہ بتایا ہے۔

گر رنج پیشت آید و گر راحت ای حکیم
رنج والم ہو یا ہو سرور و خوشی نصیب

نسبت مکن بغیر کہ اینہا خدا کند
جو کچھ بھی ہے جہاں میں خدا کی طرف سے ہے

(یعنی جس میں محبوب کی خوشی ہے اسی میں عاشق کی بھی خوشی ہے)

وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم
وفا کرتے ہیں اور رہتے ہیں خوش ہو کر ملامت بھی

کہ در طریقت ما کافریست رنجیدن
سمجھنا باعثِ غم خلق کو کفر طریقت ہے

ای دل صبور باش و مخور غم کہ عاقبت
تو صبر کر اے دل غم مت کر آخر یہ تجھے معلوم نہیں

از شام صبح گردد و از شب سحر شود
ہر شام کے بعد آتی ہے سحر، ہر شب کی سحر ہو جاتی ہے

حافظا چون غم و شادی جہان در گذر است
دنیا کے شادی و الم آتے ہیں بہم جاتے ہیں بہم

بہتر آنست کہ من خاطر خود خوش دارم
بہتر ہے یہی اے حافظ ہم دل اپنا رکھیں خوش اور بے غم

یہ خوشی صوفی کو ایک غم کے عوض ملتی ہے اور وہ ہے محبوب کا غم۔ عشق کی ٹیس سے
اس کا دل ہمیشہ گھائل رہتا ہے۔ حافظ کہتے ہیں

آنچنان مہر توام در دل من جای گرفت
مرے دل میں تری الفت ہے یوں پیوست و مستحکم

کہ اگر سر برود از دل و از جان نرود
کہ سر جائے تو جائے دل سے الفت جا نہیں سکتی

دوام عیش و تنعم نہ شیوۂ عشق است
عشق و تنعم میں رہنا، عاشق کا شیوہ ہی نہیں

اگر معاشر مایی بنوش جام غمی
تو ہے میرا رفیق اگر، جام غم یہ گزارا کر

دست طلب ندارم تا کام من برآید
نہ جبتک ہاتھ آئے تو، نہ چھوڑونگا طلب تیری

یا جان رسد بجانان یا جان ز تن برآید
یا جان جاناں کو پا جائے وگرنہ تن سے باہر ہو

مگر بہ تیغ اجل خیمہ بر کنم ورنہ
موت ہی جسم کے خیمہ کو گرا سکتی ہے

رمیدن از در دولت نہ رسم و راہ من است
در دولت کو ترے چھوڑ دوں میں، نا ممکن

اس عشق کی تعریف عراقی نے یوں کی ہے

بگیتی ہر کجا درد و الم بود
ہر خطہ میں دنیا کے جہاں درد و الم تھا

بہم کردند و عشقش نام کردند
یکجا کیا، اعلان کیا عشق یہی ہے

خواجہ حافظ کہتے ہیں جو اس دنیا میں خدا کی اطاعت اور اس کی محبت میں زندگی بسر کرتا ہے اسے ایسا مقام عطا کیا جاتا ہے جسے لوگ عقل سے نہیں سمجھ سکتے۔ یہ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس کی لذت سے آشنا ہیں۔

سحرم ہاتفِ میخانہ بدولت خواہی
صبح کو ہاتف میخانہ نے میری اقبال مندی کی خواہش میں

گفت باز آی کہ دیرینۂ این درگاہی
مجھ سے کہا کہ آ جاؤ، تم اس بارگاہ کے دیرینہ آشنا ہو

ہمچو جم جرعۂ می کش کہ ز سرِ ملکوت
جم کی طرح شراب کے گھونٹ پیو کہ ملکوت کے اسرار کے متعلق

پرتو جامِ جہاں بین دہدت آگاہی
جام جہاں بیں کا عکس تم کو خبر دیگا

بر در میکدہ رندان قلندر باشند
میکدے کے در پر ایسے رندان قلندر رہیں

کہ ستانند و دہند افسرِ شاہنشاہی
جو کسی کو تاج شاہی عطا کرتے ہیں اور کسی سے تاج شاہی چھین بھی لیتے۔

خشت زیر سر و بر تارک ہفت اختر پای
انکے سر کے نیچے اینٹ کا تکیہ ہے لیکن انکا پاؤں ساتویں آسمان پر ہے

دست قدرت نگر و منصب صاحب جاہی
انکی قدرت کو دیکھو اور انکے منصب و مرتبہ کو خط کرو

اگرت سلطنتِ فقر ببخشند ای دل
اے دل، اگر تجھکو فقر کی سلطنت عطا کر دیں

کمترین ملک تو از ماہ بود تا ماہی
تو تیری سلطنت کی کمترین وسعت ماہ سے ماہی تک ہوگی

سر ما و در میخانہ کہ طرف بامش
میرا سر میخانے کے در تک پہنچ گیا ہے وہ در جس کی

بفلک برشدہ دیوار بدین کوتاہی
بلندی آسمان تک ہے حالانکہ میں کتنا چھوٹا اور حقیر ہوں۔

اور حافظ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں:

ہرگز نمیرد آن کہ دلش زندہ شد بعشق — وہ شخص نہیں مرتا ہرگز، ہے عشق سے جسکا دل زندہ
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما — اس صفحۂ عالم پر ہیں ہوں جاوید و زندہ و پائندہ

یہاں دوام سے مراد دنیاوی شہرت نہیں ہے بلکہ صوفیہ کہتے ہیں کہ وہ قلب جو خدا کے عشق میں زندہ رہتا ہے وہ کبھی فنا نہیں ہوتا کیونکہ اس قلب کا تعلق معرفت الٰہی سے ہے اور معرفت الٰہی جس کو جس قدر حاصل ہو گئی وہ اپنی جگہ پر ہمیشہ باقی اور قائم رہتی ہے

امام غزالی کیمیائے سعادت میں لکھتے ہیں :-

لذت معرفت کہ بدل تعلق دارد — معرفت کی لذت جو کہ دل سے تعلق رکھتی
برگ اصناف آن شود کہ دل برگ — ہے وہ موت کے بعد کئی گنا بڑھ جاتی ہے
ہلاک نیشود و معرفت بجای خود بماند — کیونکہ دل موت سے ہلاک نہیں ہوتا اور
بلکہ روشن تر بود — معرفت اپنی جگہ قائم رہتی ہے بلکہ روشن تر
(ص ۱۹) — ہو جاتی ہے۔

لیکن یہ قلب جو مقام معرفت ہے وہ گوشت کا لوتھڑا نہیں ہے۔ یہ اس سے جدا اور لطیف ہے۔

حافظ کے صوفیانہ افکار و تعلیمات کے اس مختصر جائزے سے ظاہر ہے کہ یہ روحانی تعلیمات نہ صرف یہ کہ فرد کی زندگی کی متناسب اور صالح تشکیل کرتی ہیں اور اس کے کردار کو بلندی عطا کرتی ہیں بلکہ یہ تعلیمات آج کی دنیا میں بھی اتنی ہی ضروری ہیں جتنی پہلے اور چنگیز و ہلاکو کے زمانے میں تھیں۔ خدا سے محبت تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے مخلوق سے محبت، دوسروں کی ایذا رسانی سے اجتناب، سماج کی خوشحالی کے لیے سعی و عمل، کسب ہنر و فضیلت، کسب رزق، تمام حالات میں خوش رہنے کے راز کو پانا اور

جاہلیت سے احتراز، وہ اصول زندگی ہیں جن کی صداقت از خود روشن ہے اور محتاج وضاحت نہیں۔

پند حافظ بشنو، خواجہ برو، نیکی کن — حافظ کی نصیحت کو سن ائے خواجہ جا اور نیکی کر
زانکہ این پند بہ از در و گہر می بینم — اس پند کو معمولی نہ سمجھ یہ دُرّ و گہر سے ہے بڑھ کر

۱- مراجع

۱- قرآن مجید ۲- بوستان سعدی ۳- تصوف حصہ اول از سید وحید اشرف (پروفیسر) ۴- جواہر السلوک از قطب ویلور ناشر دائرۃ المعارف حضرت مکان ویلور ۵- دیوان حافظ مرتبہ محمد قزوینی و دکتر قاسم غنی ناشر انجمن خوشنویسان ایران بار دوم ۶- ROADTOMECCA از محمد اسد ۷- شرح آداب المریدین از شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (خطی مملوکہ سید وحید اشرف) ۸- خصوص الحکم اردو ترجمہ از مولانا عبد القدیر صدیقی ناشر اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی جون ۱۹۸۶ء ۹- کیمیائے سعادت نولکشور ایڈیشن ۱۳۳۲ھ ۱۰- کشف المحجوب ناشر ایران پاکستان مرکز تحقیقات فارسی اسلام آباد ۱۱- لطائف اشرفی خطی بتصحیح سید وحید اشرف ۱۲- مثنوی مولانا روم

۲- اشعار حافظ کا اردو منظوم ترجمہ بغیر کسی کاوش کے ہوا ہے۔ مقصود صرف ان لوگوں کے لیے حافظ کے مدعا کو قابل فہم بنانا ہے جو فارسی نہیں جانتے۔

حالات غدر کا ایک چشم دید گواہ!

جارج پیش شور اور

اس کی نثری تصنیف "وقایع حیرت افزا"

از

جناب نسرین ممتاز بصیر صاحبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

جارج پیش شور کی سوانح حیات پر نہ تو کوئی کتاب شایع ہوئی اور نہ ہی ان سے متعلق معلومات کہیں یکجا طور پر دستیاب ہیں۔ چند تذکروں میں تھوڑے بہت اشارے ضرور ملتے ہیں[1] اور شور کی ملازمت کے دوران کے دفتری ریکارڈ سے بھی اس سلسلے میں کچھ اطلاعات فراہم ہوتی ہیں۔ خود جارج پیش شور نے اپنے دواوین، مثنوی اور نثری تصنیف میں سوانحی احوال قلمبند کیے ہیں۔ ان میں ان کی مثنوی بہ عنوان "سوانح عمری"[2] خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس سلسلے کے تمام منتشر مواد کو یکجا کرنے کے بعد جارج پیش شور سے متعلق مندرجۂ ذیل معلومات فراہم ہو سکی ہیں:

---

[1] رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب European and Indo-European poets of Urdu and Persian میں شور کے متعلق لکھا ہے اور اس کتاب کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے لیکن مذکورہ کتاب اور اس کا ترجمہ اب دستیاب نہیں [2] اس مثنوی میں تفصیل سے یہی احوال رقم کیے ہیں مگر اب کمیاب ہیں

آباء و اجداد فرانس سے آکر ریاست گوالیار (مدھیہ پردیش) کی فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔ جد اعلیٰ کا نام کیپٹن پائش (CAPTAIN PAISH) تھا[1]

والد جان پیش ضلع میرٹھ (یو۔پی) کے مشہور و معروف رئیس۔ بعد میں ضلع علی گڑھ (یو۔پی) میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جہاں ۳۔۱۸۷۲ء میں آنکھ کی بیماری میں انتقال کر گئے۔

والدہ ہرچند پور کے مشہور رئیس فراسو صاحب (FARASU KOINE) کی بیٹی میڈلائن کوئین (MEDLIN KOINE) تھیں۔ ان کا انتقال ہیضہ کی بیماری میں ہوا۔ اپنے شوہر کے پہلو میں مدفون ہیں۔

بھائی بہنیں جارج پیش شور سے چھوٹی ایک بہن تھی جس کی شادی آگرہ (یو۔پی) کے ایک دولتمند شخص کانسٹنٹائین (CONSTANTINE) سے ہوئی ان سے ایک چھوٹا بھائی مسمّٰی جان کوئین (JOHN KOINE) تھا جس کی شادی مس ایڈلیڈ ڈیزی ڈن (MISS ADELAIDE DESSIDON) کے ساتھ ہوئی جان کوئین سے چھوٹی ایک بہن تھی میرین، جس کے خاوند کا نام کرنل گارڈر (COL. JAMES GARDER) تھا[2] سب سے چھوٹی ایک بہن آننا (ANNA) تھی۔ جالور (راجستھان) کے مسٹر بنسل (MR. BEHSLY) بیاہی تھی۔

---

[1] رام بابو سکسینہ نے Gwalior State Gazetteer اور complete Appendix .... میں مذکورہ دو کپتانوں کا ذکر کیا ہے۔ جو پائش کے نام سے موسوم ہیں جس میں سے ایک کپتان دوران جنگ مارا گیا۔ دوسرا یقیناً شور کا مورث اعلیٰ ہوگا۔ [2] یہ کرنل گارڈر کے پوتے تھے۔

پیدائش جارج پیش شوؔر کی پیدائش یکم دسمبر ۱۸۲۳ء میں علی گڈھ (یو۔پی) میں ہوئی

ابتدائی تعلیم عربی، فارسی اور اردو کے اساتذہ سے گھر ہی پر رہ کر تعلیم حاصل کی۔ شعر وشاعری نوعمری ہی سے شروع کردی۔ رحیم الدین حیا میرٹھی، قطب الدین مشیر دہلوی اور ان کے بیٹے غلام دستگیر دہلوی سے اصلاح سخن لیتے تھے۔

شادی سلوآڈور (SLUADOR) صوبہ ریاست گوالیار (مدھیہ پردیش) کی پوتی مس ماریاں (MISS MARYAN) سے ہوئی۔ ماریاں ۱۸۷۲ء میں شدید نسوانی مرض میں مبتلا ہوئیں جن کا علاج پہلے میرٹھ (یوپی) پھر دہلی اور بعد میں گوالیار (مدھیہ پردیش) میں ہوا گوالیار میں دو برس زیر علاج رہنے کے بعد ان کو دماغی خلل بھی ہوگیا۔ ۱۱ جنوری ۱۸۷۹ء میں ۴۴ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔

وہ آگرہ (یو۔پی) میں مدفون ہیں۔ دوستوں کے اصرار پر شوؔر نے ۱۸۸۰ء میں گوالیار کی سوائی سکندر کی بیوہ سے شادی کرلی۔ اس شادی کا سہرا شوؔر نے خود ہی لکھا ہے۔

اولاد ۱۸۸۱ء میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ جس کو شوؔر کی آگرہ والی بہن لیڈی کانسٹنٹائن نے گود لے لیا۔ بچی ۹ ماہ کی عمر میں دانتوں کے شدید مرض میں مبتلا ہوکر لقمۂ اجل ہوگئی۔

۱۸۸۳ء میں دوسری لڑکی پیدا ہوئی۔ ممکن ہے ان کے علاوہ بھی شوؔر کی کوئی اولاد رہی ہو لیکن اس سلسلے میں کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ اگرچہ رام بابو سکسینہ نے ایک لڑکے لیو جارج (LEO GEORGE) کا بھی تذکرہ کیا ہے

ملازمت ابتداً کچھ سال میرٹھ (یو۔پی) میں پولیس کے محکمہ میں رہے لیکن چند وجوہ کی

بنا پر استعفیٰ دے کر کول (علی گڈھ) واپس آگئے۔ اس کے بعد اگلاس (ضلع علی گڈھ) میں تھانہ داری پر تعینات ہوئے۔ مگر جلد ہی ان کو اپنے آگرہ کے عزیز کانسٹنٹائن کی سفارش پر پولیس میں نوکری مل گئی۔ جہاں پر ان کی محنت و کارکردگی سے خوش ہوکر افسران بالا نے انھیں تحصیلدار بنانے کا وعدہ کرلیا مگر نانا کے بلانے پر انھوں نے نوکری چھوڑ دی قرائن بتاتے ہیں کہ اس کے بعد شوؔر 'دیواری' میں تھانے دار مقرر ہوئے جس میں غالباً ان کے نانا کی کوششوں کو دخل تھا۔ ایمانداری، محنت اور لگن کا واضح ثبوت چار ماہ کے اندر ان کی ترقی ہے۔ وہ کسٹم (پرمٹ) میں پہنچ گئے اور چھ سال تک یہ کام بحسن وخوبی انجام دیا۔ اس کے علاوہ شوؔر نے مختلف مقامات پر ملازمتیں کیں[1]۔ ایک واقعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جب وہ لبانہ چوکی پر تعینات تھے تو پرمٹ پٹرول سے تعلقات خراب ہونے پر اس پرمٹ پٹرول نے ان کے خلاف رپورٹ درج کردی نتیجتاً شوؔر کی تنزلی ہوگئی۔ انھوں نے اس کی اپیل لفٹنٹ گورنر MONTOGOMERY کی خدمت میں پیش کی۔ مگر خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکی[2]۔

دوسرے سوانحی حالات اکیرہ گڑھ میں دو سال ملازمت کے بعد جب وہ اپنے نانا فراسو صاحب کے بلانے پر ہرچند پور گئے تو ان کے نانا نے فرمائش کی کہ بجائے ملازمت کے اپنی موروثی جائداد سنبھالیں اور اس سے قبل شادی کرلیں۔ علی گڈھ (کول) میں ان کی شادی ہوئی اور مختلف مقامات پر جشن ولیمہ منایا گیا۔ اسی زمانہ میں غدر شروع ہوگیا۔ جس سے شوؔر کا خاندان بھی شدید طور سے متاثر ہوا۔ ملازمت کے دوران ہی شوؔر صاحب کو پتہ چلا کہ ان کا چھوٹا بھائی جو فراسو صاحب کی جائداد کی دیکھ بھال کر رہا تھا

---

[1] مختلف قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کیڑہ گڑھ میں بھی ملازم تھے۔ [2] فی الحال انکی ملازمت کے بارے میں اتنی ہی معلومات تک رسائی ممکن ہوسکی ہے۔

بیمار رہکر عالم جاودانی کو کوچ کر گیا[1]۔ موروثی جائداد کے تحفظ کے لیے شور ہرچند پور گئے جہاں آکر یہ پتہ چلا کہ ایک ہندو عورت مسمّاۃ (بائی صاحبہ) جو نانا صاحب کے ساتھ رہا کرتی تھیں اس نے تمام جائداد پر ناجائز قبضہ جما رکھا ہے اور اس کو اپنے بھتیجے رام سنگھ کے نام منتقل کرنا چاہتی ہے۔ اپنی جائداد پر قبضہ رکھنے کی خاطر شور کو دو سال تک وہاں مقیم رہنا پڑا[2]۔ دوسری افتاد یہ پڑی کہ شور کے متوفی بھائی کی بیوہ اور اس کے بچوں کی جانب سے موروثی جائداد میں حصہ داری طلب ہوئی۔ آخر کار کچھ رقم پر سمجھوتہ ہو گیا۔

شور کی بعض تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے بھائی کی اولاد بدا طوار و ناکارہ ثابت ہوئیں جن کے باعث خاندان تباہ ہو گیا۔ اس واقعہ کا تذکرہ شور کے اکثر اشعار میں بھی ملتا ہے۔

عادات و خصائل | شور سیر و سیاحت کے شوقین تھے۔ اسی لیے ان کے اشعار میں مختلف مقامات کا ذکر ہے۔ وہ رقص و سرود اور ناچ و رنگ بھی پسند کرتے تھے تفریح پسند اور عیاش طبع بھی تھے۔ . . . .

ہندوستانی وغیرہ ملکی شاعروں اور اہل فن سے بھی تعلقات رکھتے تھے۔ قیاس ہے کہ غالب سے ان کی دوستی رہی ہو گی۔ کیونکہ ان کے دیوان میں غالب کی موت پر قطعات موجود ہیں

وضع قطع | سر پر دوپلی ٹوپی عمامہ شانوں پر ریشمی رومال اور اچکن عموماً زیب تن کرتے۔

وفات | ۷ فروری ۱۸۹۴ء کو وہ ایک شادی میں شرکت کے لیے مسٹر جیمس اسکنر کے

[1] ان کے نانا فراسو صاحب کا اس وقت انتقال ہو چکا تھا۔ [2] دو کارندے شیخ علیم الدین اور لالہ دیبی پرشاد کی معاونت سے شور جائیداد حاصل کر سکے۔

گھر دہلی گئے جہاں ایک ہفتہ قیام کے بعد ان کے جگر (LIVER) میں شدت کا درد ہوا ۱۶ فروری ۱۸۹۴ء کو وہ میرٹھ آئے باوجود علاج و معالجہ کے افاقہ نہ ہوا اور ۲۳ فروری ۱۸۹۴ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

شاعری اور منظوم تصنیفات | یورپین شعراء میں جارج پیش شور کو ایک خصوصی درجہ حاصل ہے۔ انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر ہی میں مشق سخن شروع کر دی ابتداً رحیم میرٹھی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ پھر قطب الدین مشیر دہلوی اور دستگیر دہلوی سے بھی اصلاح سخن لی[1]۔ کریم الدین نے ان شاعروں کا تذکرہ بھی کیا ہے جہاں شور اپنا کلام ارسال کیا کرتے تھے[2]۔

شور کی شاعری کی یادگار آج ہمارے درمیان ان کے چھ دواوین، ایک منظوم سوانح عمری اور ایک طویل نظم ہے۔ ان کا دیوان اول ۱۸۷۲ء میں باہتمام محمد رحیم الدین خاں میرٹھی مطبع چشمۂ اسلام بے خزاں سے شائع ہوا۔ اور دیوان دوم ۱۴ جنوری ۱۸۷۸ء میں مولوی ممتاز حسین اور علی بخش صاحب کی نگرانی میں ممتاز المطابع میرٹھ سے چھپا۔ دو سو بتیس ۲۳۲ صفحات پر مشتمل دیوان سوم ۱۸۸۴ء میں ہاشمی پریس سے باہتمام محمد ہاشم علی "محب کشور" کے عنوان سے اشاعت پذیر ہوا۔ پولیس پریس میرٹھ سے دیوان چہارم دو سو ساٹھ صفحات پر مشتمل زیور طباعت سے آراستہ ہوا[3]۔ دیوان پنجم ۱۸۹۰ء میں ستارۂ شور کے عنوان

[1] مولفہ لالہ سری رام مرتبہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، خمخانۂ جاوید، جلد پنجم، ۱۹۴۰ء صفحہ ۷۰ [2] مولفہ الیف فیلن و مولوی کریم الدین طبقات شعرائے ہند، طبقہ چہارم از شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی ابیل لیتھو پریس رمنہ روڈ پٹنہ، ۱۹۶۳ء [3] ۱۸۸۹ء میں ان کی ایک نظم "نظم معرفت" کے عنوان سے دو حصوں پر مشتمل شائع ہوئی۔ اسکے علاوہ ۱۸۹۰ء میں ایک فارسی دیوان شگوفہ پریس میرٹھ سے منشی وزیر علی کے زیر نگرانی چھپا۔ اسکا ایک قلمی نسخہ حبیب گنج کلکشن مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود ہے۔

سے حکیم نارائن کی زیر نگرانی پرکاش پریس میرٹھ سے شائع ہوا۔[1] ۱۸۹۴ء میں دیوان ششم
بعنوان "شورِ قیامت" باہتمام محمد سراج الدین ہاشمی پریس میرٹھ سے طبع ہوا۔[2] تین سو سولہ
صفحات کی مثنوی بعنوان "سوانح عمری" ۱۸۹۴ء میں ہاشمی پریس میرٹھ سے چھپی۔[3]

شور نے اردو زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی شاعری کی ہے۔ خصوصاً زبان
ہندی میں ان کی شاعری بہت مقبول و معروف رہی ہے۔ اس میں روایتی انداز کے
ساتھ ہندوستانیت کی روح بھی شامل ہے۔

نثری تصنیف وقائع حیرت افزا

جارج پیش شور کی ایک نثری تصنیف "وقائع حیرت
افزا" ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مولانا آزاد لائبریری مخطوطات
میں یونیورسٹی کلکشن نمبر ۲۶۱/۴۸ پر موجود ہے۔ یہ کتاب ایک سو صفحات، فی صفحہ ۱۳
(تیرہ) سطر اور ۱۶×۲۵ سینٹی میٹر سائز پر ہے۔ اس پر کاتب کا نام درج نہیں۔
البتہ خاتمۃ الکتاب پر تاریخی قطعات اور آخر میں سنہ درج ہے۔ چودہ صفحات پر
مشتمل بارہ سطر فی صفحہ، ۱۶×۲۵ سینٹی میٹر سائز پر "وقائع حیرت افزا" کا ایک قلمی
انتخاب بھی اسی لائبریری میں موجود ہے۔ اس انتخاب کے انداز خط سے پتہ چلتا ہے
کہ یہ کسی دوسرے کاتب کا رقم کردہ ہے۔

جارج پیش شور پر لکھنے والے رام بابو سکسینہ کے علاوہ کسی صاحب قلم نے
اس اہم تصنیف کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور
پر لوگ اس تصنیف سے ناواقف ہیں حالانکہ اس نسخہ کے آخر میں مندرج ہے کہ یہ

[1] اردو کے مشہور شاعر مرزا داغ کے دو دیوان کے جواب میں تحریر کیا تھا۔ [2] اس وقت شور کا انتقال
ہو چکا تھا۔ [3] یہ مثنوی ان کے سوانحی حالات پر مشتمل ہے لیکن اب نایاب ہے۔

کتاب شائع ہو چکی ہے۔

"محلہ   مطبع   در ماہ   سنہ ۱۸ بسرعت سریع طبع ہو کر سواد اس کے
سرمۂ چشم حقیقت ناظرین ہوئی ہر ایک سابق کی زبان سے شہور آفرین ہوئی پھر تو
طالب اس کے مانند مطلوب کے دست بدست لے گئے نقد دل اس پر نثار کر کے
دے گئے۔"

لیکن باوجود تلاش و جستجو کے اس کا چھپنا ثابت نہ ہو سکا۔ خود رام بابو سکسینہ نے جن کے
مطالعہ میں اس کا نسخہ رہا تھا اور جنھوں نے اپنی کتاب میں اس کا حوالہ بھی دیا ہے لکھتے
ہیں کہ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔

شور کی یہ تصنیف "وقائع حیرت افزا" غدر ۱۸۵۷ء کے انقلاب آفریں، مگر درد
ناک واقعات سے پر ہے۔ اس سے اس عظیم واقعہ کے بعض تاریخی حقائق اور ناقابل
فراموش واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً مشہور و معزز برطانوی افسران، فرنگی
عہدہ داران، غیر ملکی حکام وغیرہ نیز ان پر گزرے آلام و مصائب۔ اس وقت کے
ہندوستان کا مخصوص رنگ، چند مشہور و معروف باغیوں کے اسمائے گرامی اور
ان کے مختصر احوال۔ غیر ملکیوں کی پشت پناہی کرنے والے ہندوستانیوں کے اسمائے گرامی۔

ایک فرنگی ہونے کے باوجود محض ہندوستان کا فدائی ہونے کے ناطے جارج
پیش شور اور ان کے خاندان کے افراد کو ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں کن کن مظالم
کا شکار ہونا پڑا اس کا مفصل بیان اس تصنیف میں موجود ہے۔

کتاب کی ابتدا میں حمد و ثنا درج ہے جس کا انداز بیان آرائش و زیبائش
سے مملو ہے:

"حمد و سپاس اس خدائے پاک کی ہے جس نے رائی سے پربت بنایا اور پربت کو رائی کیا۔ تختۂ چمن گیتی کو گلہائے رنگا رنگ قدرت اپنے سے شگفتہ فرمایا، ہر ایک گل کا رنگ و بو جدا جدا کر دکھایا۔"

اس میں داستان سرائی کے انداز میں عنوانات درج ہیں مثلاً

"شروع ہونا غدر کا میرٹھ سے تاریخ ۹ مئی ۱۸۵۷ء کو اور ۱۰ ماہ مذکور کو پہونچنا اوس غلغلہ کا دہلی میں"

"شروع ہونا جنگ و جدل گورہ کا لوٹنا اور اٹھنا فتنہ و فساد دہقان و زمین داروں کا"

"بگڑنا شہنشاہ وقت کا اور بننا رعایا کم بخت کا محران" وغیرہ وغیرہ

وقائع حیرت افزا کو شروع کرنے سے قبل شور نے "آغاز داستان حیرت بیان" کے عنوان سے آرائش و زیبائش اور قافیہ و ردیف سے مملو نثر پیش کی ہے جس میں ایک روایتی میلہ کا بیان ہے جو جمنا کے کنارے لگا کرتا تھا۔ شور نے مغل شہزادوں کی شمولیت کا احوال بھی درج کیا ہے:

اس تصنیف کے اسلوب میں فسانۂ عجائب کی تقلید کی گئی ہے۔ اور اس امر کا دعویٰ خود مصنف نے بھی جا بجا کیا ہے۔ مثلاً۔

"یہ بات خاص و عام میں مشہور ہے کہ اردوے معلی کا لکھنا مشکل ضرور ہے۔ نظر بر آں فسانۂ عجائب کے مصنف نے جو حق اس زبان خوش بیان کا ادا فرمایا ہے اسکی ہمسری میں آج تک کسی نے رتبہ نہیں پایا ہے۔۔۔۔۔ شائقین جب اس کو پڑھینگے دیگر کتابہائے سوانحہ غدر کو طاق پر دھر یں گے بلکہ غالب یہ ہے کہ اگر مرزا رجب علی بیگ سرور بھی ایک نظر اس کو ملاحظ فرمائیں گے بچشم انصاف آفریں کہتے کہتے تھک جائیں گے۔

بہت جان و دل کو اس نسخہ کی نکر میں گنوایا ہے تب یہ مضمون پسندیدہ ہاتھ آیا ہے۔"

اس کتاب میں مقفع و مسجع نثر کے ساتھ ساتھ مختلف شعراء اور خود مصنف کے اشعار واقعہ کی مناسبت سے ملتے ہیں مثلاً میر سوز، سودا، جرأت، میر تقی میر، بہادر شاہ ظفر، اور بہت سا ایسا کلام جس کو شور نے بقول شخصے لکھکر بیان کیا ہے غزل ابو ظفر شاہ دہلی کے عنوان سے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

اگرچہ عقل سے الٹے ہزار دفتر کو — پلٹ سکے نہ کبھی کوئی مقدر کو
مٹا سکے نہ کوئی سرنوشت کا ایک حرف — ہزار پٹکے اگر سنگ پر کوئی سر کو
جہاں دکھائے تماشا ظہور قدرت حق — نہ وہاں فلک کو ہے طاقت نہ تاب اختر کو
محال ہے کہ رہے ایک طرح پہ یہ جہاں — کہ روز دور نیا ہے فلک کے ساغر کو
گئے جو اوروں کے در پردہ در بدر ہیں خراب — ظفر تو نہ چھوڑیو آستان حیدر کو

اسی طرح مرزا رجب علی بیگ سرور کی شاعری کے نمونے اس تصنیف میں واقعات کی مناسبت سے موجود ہیں سرور کی یہ مندرجہ ذیل غزل درج ہے:

گر اسکے ہجر میں یوں ہی اندوہ گیں رہے — تو ہو جائیگا وصال نہ یقین رہے
ہے احتیاط شرط کہ اس چشم تر یہ گاہ — دامن رہے رہے نہ رہے آستین رہے
مدفن کا اپنی ہم کو تردد ہو کس لیے — کوچہ کی تیری یار سلامت زمین رہے
تو گلشن وصال کی کر سیر عندلیب — ہم خرمن فراق کے لیس خوشہ چین رہے
جو جو کہ انتخاب تھے صفحہ پہ دہر کے — ایسے وہ مٹ گئے کہ نشاں بھی نہیں رہے
کس کی خوشی کہاں کا عیش کیسا اختلاط — ہم کو نہ چھیڑو تم کہ وہ اب ہم نہیں رہے

چھوٹا نہ نزع میں بھی خیال اس کا سرور — دم بھرتے ہم اس کا دم واپسیں رہے

اکثر لمبی لمبی غزلیں، نظم کے اشعار بعض اوقات واقعہ کی سنجیدگی کے لحاظ سے بے جوڑ لگتے ہیں۔ باایں ہمہ ان غزلیات اور اشعار کے توسط سے شور کے ادبی ذوق اور شاعرانہ شعور کا بھی کسی حد تک اندازہ ہوتا ہے۔ فارسی کے اشعار اور مقولے بھی اس میں جابجا موجود ہیں۔ دیگر شعراء کے ساتھ ساتھ مصنف کے خود اشعار اور کلام بھی اس تصنیف میں موجود ہیں مثلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جب سے ہے بت کی نظر ہم سے بگڑی ہوئی — خود بخود ساری خدائی ہے خدا بگڑی ہوئی
آجکل ہم سے ہے جو اس کی رضا بگڑی ہوئی — شاید ہم سے ہے ہماری قضا بگڑی ہوئی
پہلے تو گل کو کھلا کر پھر بہاتی ہے ہوا — چھوڑ دے خو اپنی یہ باد صبا بگڑی ہوئی
اب تو باہم بلبل اور گل کے چٹکنے جو لگی — آگئی کچھ اس چمن میں پھر ہوا بگڑی ہوئی

حمیدہ صفات و خجستہ خصال — سراپا ہیں وہ لوگ فرخندہ فال
جوان کے گل اور مرادوں کے باغ — ہیں خوشبو سے ان کے معطر دماغ
خدا خوش رکھے انکو ہر دم مدام — یہی ہے دعا میری اب صبح و شام

گئی آج کل کی جو ہوا پلٹ، نہ وہ دور ہے نہ وہ جام ہے
نہ وہ بزم ہے نہ وہ ساقی ہے نہ وہ لوگ ہیں نہ وہ نام ہے
نہ کفر سے مجھے ہی غرض نہیں دینداری کی کچھ طلب
مرا حامی ایک مسیح ہے فقط اس کے نام سے کام ہے
کبھی قتل کرتے ہیں برملا کبھی زندہ کرتے ہیں لب ہلا
یہ سب آپ ہی کا ہے شعبدہ میاں عشق تم کو سلام ہے

کبھی ذکر عشق جو چل پڑا تو ہزار شرم سے یہ کہا
ہمیں اس کی یاد سے غرض کیا صرف اپنے کام سے کام ہے
کبھی وہ بھی دن تھے کہ اے صنم میری جان و دل کو نہ تھا الم
یہ دکھایا چرخ نے کیا ستم نہ وہ چین ہے نہ آرام ہے
کہوں سحر اس کو تو ہے بجا کہا شاعروں نے بھی مرحبا
ہوا چرچا اس کا ہے جابجا عجب پیش صاحب کا یہ کلام ہے

اس نسخہ کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ انداز بیان میں آراستگی کی سعی پیہم کے باوجود شور کی نثر میں کہیں کہیں عوامی لب و لہجہ سادہ گفتگو اور روزمرہ نیز بول چال کے عناصر غیر شعوری طور پر شامل ہو گئے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس دور میں اردو نثر کا جدید رنگ سامنے آچکا تھا۔ سادگی و سلاست کی جانب اذہان مائل تھے تحریریں براہ راست اور سادہ حرف مدعا کی غماز تھیں قدیم فارسی آمیز نثر کو ترک کرنے کی کوششیں جاری تھیں لیکن اس کے باوجود ایک طبقہ ایسا ضرور تھا جو مقفٰی و مرصع نثر کو نمونۂ کمال تصور کرتا تھا۔ اور اس بات کی حتی الوسع کوشش کرتا کہ ان کی تحریروں میں ادبیت کی چاشنی اور صنائع لفظی کا اہتمام ہو اسی حلقہ میں شور صاحب بھی شامل ہیں۔

شور نے کتاب کی ابتداء میں لکھا ہے کہ یہ سرگذشت چند یاران طریقت و دوستان محبت کی فرمائش پر لکھی ہے کیونکہ غدر کے حالات کے وہ بنفس نفیس گواہ تھے انکی فرمائش پر وقائع حیرت افزا تصنیف کی جس کے شروع میں قصہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"شروع ہونا غدر کا میرٹھ سے تاریخ ۹ مئی ۱۸۵۷ء کو اور ۱۰ ماہ مذکور کو پہنچنا اس کا غلغلہ دہلی میں۔

یہ ہزاران شور قیامت پر ملامت بلبل نوا سنج ہزار داستان وطوطی خامۂ خوش بیان اس سانحہ جاں سوز جگر دوز کو سنکر گلشن تقریر میں آئی جس کا وہم وگمان بھی نہ تھا...... بعد طے مراحل وقطع منازل دہلی سے چل کر جب ۱۲ بجے دوپہر کو تاریخ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء مقام ہرچند پور پاس مسٹر زالنیس کوین صاحب نانا اپنے رئیس ہرچند پور کے پہونچا ہنوز تکان راہ سے ٹک تسکین نہ پائی تھی اور گفتگو ضروری ناناصاحب سے اختتام پر نہ آئی تھی کہ ناگاہ اپنے نوکر و خدمت گذار رعیت و زمیندار بے اختیار مختلف و سرکش افواج سرکاری واقع میرٹھ و دہلی کا سنا کر ہوش اڑانے لگے"۔

شور نے لکھا ہے کہ بعد کو پتہ چلا کہ میرٹھ کی کل فوجوں نے بغاوت کردی ہے نتیجۃً پورے ہندوستان میں خون ریزی کا بازار گرم ہوگیا۔ جو لوگ میرٹھ سے فرار ہوکر ہرچند پور آئے انھوں نے بتایا کہ ہندوستانی فوج نے کارتوس کاٹنے کے خلاف ہنگامہ برپا کیا ہے حکام انگریزی کے بنگلے اور کوٹھیاں خاکستر کردی ہیں اور انگریزوں کے خلاف جنگ وجدل کا بازار گرم ہوگیا ہے چونکہ شور کے نانا ہرچند پور اور آس پاس کے علاقوں میں صاحب جاہ وثروت شمار ہوتے تھے اسی لیے بلوائیوں کی نظر میں ان پر بھی مرکوز ہوگئیں اسی درمیان فراسو صاحب اور شور کو یہ اطلاع ملی کہ:

"ایک قافلہ میم لوگ اور صاحب لوگوں کا دہلی سے فرار ہوکر بحالت کشتہ وخستہ موضع کنکیرہ میں افتاں وخیزاں آیا ہے۔ اور کسی جوگی نرد گی کے گھر پر اوس نے

جائے امن پائی ہے...... غرضیکہ خفیہ اوس جوگی کے پاس زبانی اوس خبر رساں کے پیغام بھیجا کہ تم کرپا کرکے اوس قافلہ کو یہاں پہونچا دو اور ہم پر اپنی دیا فرما دو۔ چنانچہ وہ سنتے ہی غنیمت جان کر روز علی الصباح ایک چھکڑہ میں معرفت زمینداران دیہہ کے سب صاحبان بے سروسامان کو سوار کرکے ہرچند پور لایا...... جس وقت وہ صاحبان مفصلہ ذیل یعنی مسٹر نیوٹ صاحب بہادر لفٹنٹ کرنیل ۳۸ رجمنٹ بلم پیٹر مسٹر ولسن صاحب لفٹنٹ توپخانہ دہلی سالکیڈ صاحب انجینیر بارکما سسٹر دہلی۔ جارج فارسٹ صاحب لفٹنٹ توپخانہ کمسریٹ ومیگزین دہلی مانگیٹلگو پر اکٹر صاحب لفٹنٹ ۳۸ رجمنٹ دہلی ٹیرو اے بٹ صاحب لفٹنٹ پلٹن مانٹ ۵۴ لمبر مسٹر مارشل صاحب سوداگر دہلی مسٹر فارسٹ صاحب موصوف معہ ۳ دختر خجستہ اختر مسٹرس کپتان فریزر صاحب انجینیر سنفر مینہ یعنی دختر کرنیل فلسٹر صاحب مرحوم مسٹرس نومیم کدائی صاحب معہ یک بابا صغیر سن کہ ہمگی ۱۷ آدمی زن ومرد معہ بچگان پریشان و آوارہ تھے غریب خانہ کاشانہ میں ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو تشریف لائے"۔

یہ لوگ ابھی قیام پذیر ہی ہوئے تھے کہ تشویش ناک خبر آئی کہ کچھ اشخاص ان انگریز حکام کی تلاش میں ہرچند پور آئے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر یہ وضاحت ہوئی کہ

"...... تم اندیشہ نہ کرو اور ہرگز نہ ڈرو ہم ملازم سرکار ہیں۔ صاحبان وارد ہرچند پور کو لینے آئے ہیں انکے لیے مدد سواران لائے ہیں"۔

ان افراد میں کپتان گاف اور مسٹر مکتری صاحب دو افسران شامل تھے۔ جارج پیش شور نے ان اشخاص کی روانگی پر ان سے سند نامہ لکھوالیا کہ دوران غدر انکے اہل خانہ

نے برطانوی حکام کی حتی المقدور خدمات انجام دیں۔

"انھوں نے بہت خوبی اور خوش اخلاقی سے فی الفور قلم اٹھا کر ایسا کچھ بحق ہم لوگوں کے کلمہ خیر ارقام فرمایا کہ خدا کو پسند آیا مرتبہ خیر خواہی اس کے بدولت سرکار دولت مدار سے پایا۔ اور مجلدوی اس کے بعد عمل درآمد سرکار چار گانو گنجا لینے بصیغہ مال گذاری بہت عزت اور خاطر داری سے ہم لوگوں کو نواب گورنر جنرل صاحب بہادر نے مرحمت فرمائی۔"

جارج پیش شور نے لکھا ہے کہ ان کے جانے کے بعد متعدد انگریز اور برطانوی حکام بالا وافسران اعلیٰ ہر چند پور آتے رہے اور ان کے نانا فراسو صاحب ہر طرح انکی محافظت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

"پس ازاں، ۲۷ر مئی ۱۸۵۷ء کو مسٹر طاس ہالینڈ صاحب کو اٹر ماسٹر دہلی ہمراہ نامراج نامی ایک جاٹ سکنہ موضع بھلسوہ پرگنہ علی پور کے بحالت محرومی وتباہی دل خستگی و پیالہ پائی یکایک ہر چند پور میں تشریف لائے۔"

شور نے ایک ڈاکٹر صاحب کا حال کچھ اس انداز سے لکھا ہے:

"۴ر جون ۱۸۵۷ء کو ایک صاحب اور بٹین صاحب نامی ڈاکٹر جلیل القدر بہ لباس جوگیانہ اور وضع رندانہ گلے میں چند مالا ہاتھ میں تانبہ کا پیالہ کاندھے پر مرگ چھالا کرتے دھوتی شنگرفی تن پہ سجائے ...... ان کی رنگ برنگ باتیں اور بیراگ سنکر نہایت حیرت و تعجب ہوا۔ پھر بغور دیکھا تو صاحب موصوف ہفت زباں ہیں ...... فرمانے لگے کہ ہم نے اپنے کو پنڈت کشمیری کسی جگہ ظاہر کرکے اس زبان کی بدولت باغیان سے نجات پائی کہیں بیراگی

بنا کر جان بچائی۔"

اپنی اس تصنیف میں مصنف نے بڑے مفصل انداز میں ان "باغیوں" اور "فسادیوں" کی بھی نشاندہی کی ہے جن سے ان کا براہ راست سابقہ پڑا تھا۔ ان کے نانا فرانسیس کوئین کو اذیت اور نقصان پہونچانے والوں میں موضع بجھولی ضلع میرٹھ کا ایک جاٹ "شاہ مل" بھی شامل تھا۔ شور نے لکھا ہے کہ اس کی نظریں روپیہ کی لالچ میں ہر چند پور کی جانب مسلسل لگی ہوئی تھیں۔ ۵ر جولائی ۱۸۵۷ء کو ایک برہمن سیاہ مل کا خط لیکر آیا جسمیں سیاہ مل عرف شاہ مل نے مال و زر طلب کیا تھا۔ فراسو صاحب نے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا اور جواب میں ۱۳ر جولائی کو اس نے حملہ آور ہونے کی دھمکی دی۔ اس سے قبل کئی بار ان لوگوں نے آس پاس جائے فرار تلاش کیا لیکن ہندوستانی زمینداروں نے فضا کا اندازہ کرتے ہوئے انھیں پناہ دینے سے قطعاً انکار کر دیا۔ ۱۵ر جولائی کو ان لوگوں نے صبح سامان سفر باندھا فراسو صاحب معہ اہلیہ وہیں رہے لیکن ساتھ جانے کے لیے بھی کوئی نوکر ملازم تیار نہ تھا البتہ سیتارام نے ساتھ دیا اور ان کے ہمراہ ہوگیا۔ برسات کا موسم تھا۔ ہنیدن ندی کے کنارے پہونچتے پہونچتے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی، دور دور کشتی کا نام ونشان نہ تھا۔ ان لوگوں نے کچھ عرصہ قیام کو سوچا کہ ہندوستانی دوست سیتارام نے مشورہ دیا:

"صاحبو مجھ کو آپ کی فرمانبرداری سے کچھ عذر نہیں مگر غرض بے غرض میری مانو تو اس جگہ کے قیام کی ہرگز دل میں نہ ٹھانو کس واسطے کہ یہ جنگل اور ویرانہ ہے جہاں اپنا نہ بیگانہ ہے صرف یہ گاؤں اقوام اہیر بے پیر کا نظر آتا ہے سو ان لوگوں کا کیا اعتبار بلکہ ایک زمانہ تمھارا دشمن و نہار ہے اس سے بہتر

ہے کہ اس چارپائی موسوم گھناٹی پر قدم رکھ کر بنام خدا تدبیر عبور فرمائیے۔"

کسی کسی طرح یہ قافلہ ندی پار کر کے میرٹھ چھاؤنی پہونچا۔ وہاں پہونچنے پر پتہ چلا کہ ہرچندپور پر باغیوں کا حملہ ہوا اور فراسو صاحب کو سخت نقصان جانی و مالی پہونچا۔ مگر تیسرے ہی دن فوج انگریزی کی امداد ہرچندپور پہونچ گئی اور سیاہ مل وغیرہ کو پھانسی دی گئی۔

دوران غدر علی گڈھ کے کیا حالات رہے تھے۔ یہ علاقہ اس واقعہ سے کتنا متاثر ہوا اس تصنیف سے اس کا کسی حد تک اندازہ ہوتا ہے۔ علی گڈھ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"آخر کو جب میرٹھ سے ہوائے گرم شور و فساد کی چلتی ہوئی علی گڈھ میں آندھی کی طرح پہونچی تب وہاں کے لوگوں کے دل سرد ہونے لگے حواس خمسہ کھونے لگے جانا کہ کچھ بدمعاشان کا زور ہے سو وہ سرکار سے سزا پائیں گے سرنگوں ہو جائیں گے۔ انجام کار اس وہم و گمان میں ایک دم و ایک آن میں تاریخ ۲۰ ماہ مئی ۱۸۵۷ء کو اسی طرح کا شور قیامت با ملامت کالوں کی جانب سے اٹھ کر علی گڈھ میں برپا کیا۔۔۔۔۔ جو تھوڑی سی فوج سرکاری کہ ہمیشہ سے علی گڈھ میں رہتی تھی وہ بھی بے سروپیر ہو کر ہمجنسوں میں شامل ہوئی۔ نمک حرامی سے جیتے جی جہنم واصل ہوئی پھر تمام شہر کے بدمعاشوں اور اچکوں کی گویا روزی کھل گئی۔ روز بروز ہمراہ فوج باغی جو ادھر ادھر سے براہ علی گڈھ گذرنے لگے ہاتھ غارتگری کا صاف کرنے لگے۔"

شور جب میرٹھ تھے اس وقت موتی نامی سائیس کے ہاتھ یہاں کے احوال ان کے والد صاحب نے بھجوائے تھے کہ ۸ جون کو ۹ بجے صبح جب شور کے والد اور اہل خاندان ناشتہ

کر رہے تھے کہ باغیوں نے دھاوا بولا تمام لوگ کوٹھے پر چھپ گئے۔ فسادیوں نے گھر لوٹ لیا۔ اہل خانہ نے ہمسایہ خوشوقت علی کے گھر پناہ لی۔ پھر اپنی عزیزہ پدرون صاحبہ کے یہاں مقیم رہے۔ جب باغیوں نے پدرون صاحبہ کے گھر کا رخ کیا تو خواتین بھاگ کر خاکروب کے گھر میں چھپ گئیں۔ والد کوٹھار کے کونے میں روپوش ہو گئے۔ اگرچہ "تینی چند" باغی معہ گروہ کوٹھار تک گیا۔ مگر انھیں شک بھی نہ ہو سکا کہ اس کوڑے کرکٹ کے اندر کوئی بیٹھ بھی سکتا ہے۔ مخبروں نے باغیوں کو خبر دی کہ فرنگی خواتین خاکروب کے گھر میں چھپی ہوئی ہیں۔ باغیوں نے خاکروب کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور خاکروب کی خواتین کو ڈرایا دھمکایا۔ انھوں نے کہا کہ فرنگی خواتین تو نہیں ہاں چند مسلمان عورتیں ہمارے گھر پناہ گزیں ہیں۔ فسادیوں نے کہا کہ انھیں ہمارے پاس لاؤ تب میم صاحبہ نے مصلحت جانا کہ روپوش رہنے سے خطرہ ٹلنے والا نہیں۔ انھوں نے خود گفتگو کرنے میں عافیت جانی چنانچہ شور نے لکھا ہے:

"اول اپنے کو موسیٰ بابا بحفظ مسلمان بنایا آپ پردہ کیا کنیزکوں کو در پردہ آگے بڑھایا۔ وہ لوگ کنیزکوں سے دریافت کرنے لگے کہ تم کہاں سے آئی ہو اور کون ہو انھوں نے جواب دیا کہ ہم بیچارہ مسلمان ہیں تباہ و پریشان ہیں اور یہ دو عورتیں پردہ دار ہیں ابھی ہمارے مرد شادی کر کے لائے ہیں اس واسطے یہ البتہ پردہ کرتی ہیں تم سے ڈرتی ہیں۔ ایک بولا ان کا جسم سرخ و سفید معلوم ہوتا ہے تمہارا بیان ہم کو دھوکا دینا ہے۔۔۔۔ میم صاحبہ نے بحکمت عملی جواب دیا کہ ہم تو فرنگیوں سے کنارہ اور پرہیز کرتے ہیں۔ محمد کا دم بھرتے ہیں۔ تم کو قتل کرنا ہے تو حاضر ضرور ہیں۔ ورنہ مسلمان بہرصورت

ظاہر ہیں پھر دوسرے نے پوچھا مرد تمہارے کہاں گئے ہیں جو تم نے اہل اسلام ہو کر بجائے خاکروب قیام کیا۔ ایسا کام کیا۔ کینز کوں نے جواب دیا کہ مرد ہمارے اس حویلی کے نوکر تھے جب آج حویلی کی لوٹ ہونے لگی تب ہم سب خوفزدہ ہو کر فرار ہوئیں زندگی سے بیزار ہوئیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر پوچھا تمہارے مردوں کا کیا نام ہے اور حویلی والے صاحب کا اب کہاں قیام ہے کینزکوں نے کہا کہ ایک کا نام امام خاں دوسرے کا دیندار خاں ہے"۔

اس طرح مختلف جگہوں پر یہ لوگ چھپتے چھپاتے رہے کہ ان کے دوست شیخ خوشوقت علی صاحب نے انھیں رتھ میں بٹھا کر سنھول ضلع علی گڈھ پہونچا دیا۔ جہاں چھ ماہ ان لوگوں نے قیام کیا۔ مسٹر کاکس کی آمد پر شورؔ کے والد نے انھیں علی گڈھ خط لکھا انھوں نے ان غیر ملکیوں کو واپس عزت و آبرو سے بلا لیا مگر کچھ عرصہ بعد پھر ہنگامہ ہوا اور یہ لوگ ٹھاکر داس کی مدد سے ہاتھرس میں چوبے گھنشیام داس کے گھر میں پناہ گزیں ہوئے۔ ہر طرف امن و امان ہونے کے بعد یہ لوگ علی گڈھ واپس آئے۔

اس پوری کتاب میں مختلف مقامات میں غدر کے اثرات، اس سے متعلق افراد کی تصویریں سامنے آتی ہیں اور ایک غیر ملکی کے تاثرات، احساسات و جذبات کی صحیح معنوں میں ترجمانی بھی ہوتی ہے۔

کتاب کے آخر میں شورؔ نے "خاتمہ کتاب لاجواب" رقم کیا ہے اور اشعار تاریخ بھی لکھے ہیں۔ شورؔ لکھتے ہیں:

"جب قصہ یہ تمام ہوا اور مشہور و معروف بخاص و عام ہوا تو پہلی فکر اس کے

مطبع مولف در آئی دریں ضمن ہاتف غیب سے یہ ندا ایک بیک سنائی،

قطعہ تاریخ

لکھا پیشؔ صاحب نے احوال غدر — سمجھ لیویں مطلب کو شایق فہیم
پڑھے جو کوئی غدر کی سرگذشت — کرے دل میں وہ خوف رب کریم
خبر دیتی ہے غدر کی یہ کتاب — پڑھی اس کی تاریخ مخبر عظیم

منشی ہرگوپال تفتہؔ نے بھی اس کتاب پر تاریخی قطعہ لکھا ہے۔

خواہی چہ زماو قائع ہند خوشاب — بودست بلا وقائع ہند خوشاب
با تفتہ نشین و عیسوی بشنو — حیرت افروز وقائع ہند خوشاب

مظفر علی راقمؔ صاحب کا قطعہ تاریخ حسب ذیل ہے:

بگفتا پیشؔ صاحب چوں کتاب نو بطرز نو — پسند خاطر ادنیٰ و اعلیٰ حرف حرف آمد
بہ بزم لفظ پرداز ان معنی سنج ای راقم — عروس سال تاریخش تو اریخ شگرف آمد

اس کتاب کے آخر میں تقریظ بھی ہے جس سے ۲۳ر ماہ ستمبر ۱۸۶۲ء سنہ تصنیف پتہ چلتا ہے۔

غالبؔ مدح و قدح کی روشنی میں حصہ دوم

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمان مرحوم

غالب کی زندگی سے لے کر ۱۹۶۹ء تک ان کی مدح و قدح میں جو کچھ لکھا گیا تھا، فاضل مصنف نے اس کا پوری دیدہ وری کے ساتھ دو جلدوں میں جائزہ لیا ہے اور اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے اس کی دوسری جلد موجود ہے۔ جس کی قیمت ۲۸ر روپیے ہے۔

"منیجر"

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور

۲۸ مارچ ۱۹۵۰ء

شعبۂ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ
پنجاب یونیورسٹی

مکرمی و معظمی جناب اصلاحی صاحب

السلام علیکم۔ گرامی نامہ نے سرفراز کیا اس کے ساتھ ہی مارچ کا معارف ملا[۱] جس کے لیے شکرگذار ہوں۔ میرے مضمون ڈاکٹر محمد حسین ھیکل (ص) میں کسی دوسری جگہ کے بجائے روسی کسان چھپ گیا ہے، اس کی تصحیح فرمادیں[۲]۔

اسی شمارے میں مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کے بارے میں آپ کا دلچسپ مضمون نظر سے گذرا۔ گذارش ہے کہ یہ مسئلہ گذشتہ صدی سے عالم اسلام کے مفکروں اور ماہرین تعلیم کی فکر و نظر کا محور رہا ہے۔ ارباب ندوۃ العلماء نے تو اس موضوع پر کافی لٹریچر پیدا کر دیا ہے بلکہ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے تو مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت پر ایک مستقل کتاب لکھ دی ہے۔

مصر میں مفتی محمد عبدہ اور سید محمد رشید رضا نے جامعہ ازہر کے نظام تعلیم کی اصلاح کو اپنی زندگی کا مقصد ٹھہرا لیا تھا۔ افسوس ہے کہ ان اکابر کو اپنی زندگی میں

---

[۱] ڈاک کے حسن انتظام کا یہ حال ہے کہ ۲۸ مارچ کا یہ مکتوب مکتوب الیہ کو ۲۰ اپریل کو موصول ہوا اسلیے اپریل کے بجائے مئی میں شایع ہو رہا ہے [۲] محولہ مضمون میں اس غلطی کا پتہ نہیں چل سکا، (معارف)

کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ان کے مخالفین ان بزرگوں کو معتزلی اور وہابی کہہ کر بدنام کرتے رہے۔ ہندوستان میں بھی صورت مولانا شبلیؒ اور ان کے ہم نواؤں کو پیش آئی تھی اب ان اکابر کے تلامذہ اور معتقدین کی علمی مساعی کی بدولت جامعہ ازھر جدید قسم کی یونیورسٹی بن گیا ہے۔ تونس کی جامعہ زیتونہ اور فاس (مراکش) کی جامعۃ القرویین میں بھی اصلاحات عمل میں لائی گئی ہیں اور ان جامعات میں دینی تعلیم کے علاوہ جدید علوم کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان جامعات کے ساتھ بڑے بڑے اوقاف بھی ہیں۔ اس وجہ سے یہ جامعات سرکاری امداد و اعانت سے بے نیاز ہیں، اور ریاست در ریاست کا درجہ رکھتے ہیں۔

(۲)

ہندوستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء علیہ الرحمۃ نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کی دینی ضروریات کے لیے ایک مختصر سا نصاب تعلیم مرتب کرایا تھا جس کی مدت تعلیم صرف ایک سال تھی۔ حضرت ممدوح نے فارسی میں صرف و نحو کے مختصر رسالے لکھوائے تھے۔ غالباً علم صرف میں زرادی اسی زمانے کی تصنیف ہے۔ سال کے پہلے تین چار مہینوں میں صرف یہی رسالے پڑھائے جاتے تھے۔ اس کے بعد دن میں چاشت سے لیکر زوال تک قرآن مجید کا سادہ ترجمہ پڑھایا جاتا تھا اور ظہر سے لیکر عصر تک فقہ میں رسالہ قدوری اور بس۔ حضرت کی صحبت کی برکت سے طلبہ میں تہذیب نفس پیدا ہوتی تھی اور ان میں اٹھنے بیٹھنے، بات چیت کرنے اور ملنے جلنے کا سلیقہ پیدا ہوتا تھا۔

اب اس نصاب تعلیم میں اس طرح ترمیم کی جا سکتی ہے کہ طلبہ کو علم صرف میں حافظ عبدالرحمان امرتسری کی کتاب الصرف اور نحو میں نحو میر (اردو ترجمہ) اور

زبیری پڑھادی جائے۔ اس کے بعد قرآن پاک کا سادہ ترجمہ پڑھانا آسان ہوجائیگا۔
فقہ میں قدوری کا ترجمہ یا اور کوئی آسان فقہ کی کتاب پڑھادی جائے۔ اگر اس نصاب
کو دو سال تک پڑھادیا جائے تو حدیث میں ادب المفرد (امام بخاری)، یا ریاض الصالحین
پڑھانے کے علاوہ مقامی سرکاری زبان اور کوئی دستکاری سکھلانے کی بھی گنجائش
پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس مختصر سے کورس پڑھانے کے بعد طالب علم انگریزی کے
ہائی اسکول میں داخل ہوسکتا ہے یا اپنے ذوق کے مطابق اعلیٰ عربی تعلیم کے لیے
کسی عربی مدرسہ میں جاسکتا ہے۔ ہر طالب علم کو عربی کی اعلیٰ تعلیم دلانا یا اسے دورہ
حدیث میں شامل کرنا تکلف ہے۔

آپ نے عربی مدارس میں سائنسی تعلیم رائج کرنے کی بھی تجویز پیش کی ہے
جو خوش آئند ہے، لیکن یہ عربی مدارس جو غریب مسلمانوں کی امداد و اعانت سے
چلتے ہیں، سائنس ماسٹر کی تنخواہ اور سائنس لیبارٹری کے قیام کے مصارف کے لیے
سرمایہ کہاں سے لائیں گے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ ان مدارس کے مزاج اور ماحول کی
وجہ سے عربی خواں طلبہ میں علوم سائنس کی طرف بالکل رغبت نہیں ہوتی۔ آج سب سے
بڑی ضرورت یہ ہے کہ تعلیم کے گرتے ہوئے معیار کو روکا جائے۔ تفسیر میں پہلے بیضاوی
سورہ بقرہ تک ..... پڑھائی جاتی تھی۔ اب تبرک کے طور پر صرف پہلا پاؤ پڑھایا
جاتا ہے۔

اب ہمارے ہاں ہر بڑے شہر میں عربی کے مدارس قائم ہوچکے ہیں، بیشتر
میں دورہ حدیث کا بھی انتظام ہے۔ لیکن میرا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ ان مدارس
کے نوے فی صد فارغین عربی کی عبارت کو صحت اعراب کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے۔

بیشتر طلبہ صرف وقت گذاری کے لیے ان مدارس میں پڑے رہتے ہیں۔

آج ہمارے ہاں فکری انتشار برپا ہے۔ انکار حدیث کے بعد اب علم فقہ اور
فقہائے مجتہدین کی تنقیص و توہین کی جارہی ہے، فقہ حنفی کو فقہ ملوکیت اور ائمہ مجتہدین
کو درباری فتویٰ باز کہا جارہا ہے، علماء سیاست میں پڑکر اپنے اصلی فرائض سے غافل
ہوگئے ہیں۔ نفسا نفسی کا دور دورہ ہے۔ معاشرے سے ایثار، محبت، ہمدردی اور
رواداری جیسی صفات مٹتی جارہی ہیں۔ ہر شخص اپنا حق جتانے کے لیے مرنے اور مارنے
پر تیار ہے، لیکن فرض کی ادائیگی سے غافل بلکہ گریزاں اور کام چور ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم
سب پر اپنا کرم فرمائے۔

اس طول نویسی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ یہ خط بلا قصد لمبا ہوگیا ہے۔

رفقا کی خدمت میں سلام پہنچے

آپ کی معارف نوازی کے لیے مکرر شکر گذار ہوں

فقط والسلام

نیازمند۔ شیخ نذیر حسین

مکتوب مدینہ منورہ

مدینہ منورہ

۱۴/۱۴ رمضان المبارک چہارشنبہ (یوم الاربعاء)

محب گرامی قدر جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی! وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

میں ابھی حرم شریف سے آرہا ہوں وہاں آج ہمارا حفلہ سنویہ

(سالانہ جلسہ) تھا، جلسہ یہاں دارالقضا کی اصطلاح ہے، ہمارے ہاں کہتے ہیں
آج "پیشی" ہے یہاں کہتے ہیں آج جلسہ ہے، "ہمارا" کی تشریح یہ ہے کہ یہ عاجز پچیس (۲۵)
برس جس کام میں مشغول رہا وہ "جماعۃ تحفیظ القرآن" کا کام تھا، آج جو تقریر
(رپورٹ) سنائی گئی اسی میں بتایا گیا اسوقت ہمارے ۱۳۵ مدرسے ہیں للبنین (ذکور)
لڑکیوں کے اس کے علاوہ ہیں لڑکوں کی مجموعی تعداد پانچ ہزار سے اوپر ہے اور
لڑکیوں کی چھ ہزار سے زیادہ ہے، جن لڑکوں نے اس سال پورا قرآن حفظ کرنے
میں کامیابی حاصل کی ان کی تعداد ۵۴ ہے دس پاروں میں پاس ہونے والے
تین سو ہیں اور پانچ پاروں میں کامیاب ہونے والے پانچ سو۔ یہ صرف مدینہ منورہ
کے مدارس کے اعداد و شمار ہیں، پچھلے دنوں جدہ گیا تھا وہاں معلوم ہوا کہ طلبہ کی
تعداد اٹھارہ ہزار تک پہنچ چکی ہے اور اسوقت یہ مدارس سعودی عرب میں اقصیٰ
جنوب سے اقصیٰ شمال تک پھیلے ہوئے ہیں، طلبہ کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے
زائد ہوگی۔ ہمارے ملک فہد صاحب جو اب "خادم الحرمین الشریفین" کہلانا زیادہ
پسند کرتے ہیں یعنی رسمی و سرکاری طور پر بھی ان کا خطاب ہے، اس شخص کو بھی
حفظ قرآن سے بہت دلچسپی ہے، کئی سال سے اعلان فرما دیا ہے کہ قید خانوں میں جو
قیدی قرآن مجید حفظ کرے گا اس کی آدھی مدت معاف کر دی جائے گی۔ اس طرح
قید خانوں میں لوگ حفظ کرنے پر ٹوٹ پڑے ہیں، ہاں ہمارے یہ مدارس نائٹ
اسکول کے طور پر ہیں، دن میں بچے اپنے اسکولوں میں جاتے ہیں، عصر سے مغرب
تک ہمارے ہاں آتے ہیں۔ بعض مدرسے عشا تک بھی ہیں اور چند ایسے بھی ہیں
جو سارے دن جاری رہتے ہیں، جو بات اصل کہنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ان مدارس

کی بنیاد ایک پاکستانی تاجر نے رکھی وہ بھی ایک لاعلمی کی بنا پر۔۔ رمضان کے مہینہ
میں (۲۵ برس پہلے) وہ مکہ مکرمہ آئے ہوئے تھے وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ لوگ
قرآن ہاتھ میں لے کر نماز (نوافل) کی امامت کرا رہے ہیں شوافع کے یہاں چونکہ یہ
جائز ہے وہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے، اور انسان کی طبعی سہولت پسندی کو
اسی جواز نے ان کے ہاں حفظ قرآن تقریباً ختم کر دیا۔ یہ سارے علاقے۔ شافعی
علاقے جو میں نے جنوبی ہند (مدراس) سے لے کر ملایا، سنگاپور، انڈونیشیا، تھائی لینڈ
تک دیکھے۔ وہاں یہی عالم پایا وجہ وہی شافعی مسلک جو ان ملکوں میں عام ہے،
انڈونیشیا میں قرأت کا زور ہے، عورتیں بھی خوب قاری ہوتی ہیں مگر حافظوں کا
کال ہے، ہاں یہ پاکستانی تاجر جن کے دفتر حساب میں لاکھوں کا اجر و ثواب لکھا
جا رہا ہے خود ایک نومسلم باپ کے بیٹے تھے، ان کا نام محمد یوسف سیٹھی تھا اور ان کے
والد جو سکھ سے مسلمان ہوئے تھے۔ ان کا نام عبدالرحیم رکھا گیا تھا، درحقیقت یہ
ان کے والد ہی کی وصیت تھی، جس کی تعمیل میں انھوں نے پاکستان میں قرآن مجید
کے مدرسے کھولنے شروع کیے تاآنکہ وہاں بھی طلبہ کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی،
سیٹھی صاحب مرحوم کا مقصود صرف حفظ قرآن نہیں تھا بلکہ قرآن فہمی اور اس پر عمل بھی
ان کی اسکیم میں داخل تھا، خیال فرمائیں کہ جب میں نے آغاز کار میں بعض مدارس طلبہ
کی قلت، مدرسین کی عدم قابلیت، اہل محلہ کی غفلت و بے اعتنائی کی بنا پر بند کر دیئے
تو مرحوم سیٹھی صاحب نے فرمایا "بھائی میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ اگر ایک بچے نے مسجد میں
آکر دو رکعت نماز پڑھ لی تو میرا تو پیسہ وصول ہو گیا"۔ قرآن فہمی کے ضمن میں مدارس میں
برابر مذاکرات اور محاضرات کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ اب سے ۲۵ برس پہلے حرم شریف

کے علاوہ کہیں کسی مسجد میں تراویح نہیں ہوتی تھی، اب یہ ہے کہ ۱۳۵ مسجدوں میں تو مدینہ منورہ میں تراویح ہورہی ہے اور اسی طرح دوسرے شہروں میں، یہ ہمارے ہی بچے ہیں جو ان مساجد میں جاکر تراویح پڑھاتے ہیں اس سال مسجد قبا، مسجد میقات، مسجد الشہداء (امیر حمزہ) جو شہر کی سب سے شاندار، وسیع و عریض مساجد ہیں، ہمارے ہی طالب امامت کرا رہے ہیں، بلکہ خود حرم شریف میں بھی ہمارا تعلیم و تربیت یافتہ طالب تراویح پڑھا رہا ہے اور وہ ایسے والہانہ انداز میں پڑھتا ہے کہ لوگ اس کے عاشق ہوگئے ہیں یہ بھی عرض کردوں کہ یہ پہلا موقع ہے کہ تراویح (حرم شریف) کے لیے کسی ہندی یا پاکستانی الاصل بلکہ غیر عربی کو منتخب کیا گیا ہو، اس مقری کا نام محمد ایوب ہے اور ان کے باپ جو برما سے ہجرت کرکے آئے تھے ابھی حیات ہیں، برما کی بجائے ان کا پاسپورٹ پاکستانی تھا۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اس موقع پر مرحوم و مغفور محمد صالح قزاز صاحب کا ذکر نہ کروں، جو بعد میں رابطہ عالم اسلامی کے امین العام ہوگئے تھے، یوسف سیٹھی اگر بانی اول ہیں تو یہ بانی ثانی ہیں، سیٹھی صاحب نے جب اپنی اسکیم ان کے سامنے رکھی تو اس کے عاشق ہوگئے اور تن من دھن ہر طرح سے اس پر قربان، انہی کا دم تھا، انہی کا اثر و رسوخ کہ سیٹھی صاحب کو سارے ملک میں کام کرنے کی اجازت مل گئی صالح قزاز صاحب جن کا ابھی اسی سال انتقال ہوا مرتے دم تک اسی کام میں منہمک رہے، سیٹھی صاحب کے انتقال کو شاید سات سال ہوئے حضرت مولانا ابوالحسن علی زید مجدہم فرماتے تھے کہ سیٹھی صاحب کا جس کمرہ (کراچی) میں انتقال ہوا وہ بوقت وفات قدرتی خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ نو مسلمین میں ایمان کی

تازگی ہوتی ہے جوش و خروش ہوتا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کا جوش و خروش اور قوت عملی دنیا کو معلوم ہے، مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے والد بھی نومسلم تھے، کتنا انھوں نے کام کیا مولانا علی میاں بھی ان کے شاگرد ہیں اور عند اللہ قبولیت کی یہ نشانی کہ چھ ماہ تک ان کی قبر سے خوشبو آتی رہی، تبلیغی جماعت جو اس وقت دنیا میں مشہور ہے، مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اس کے دوسرے بانی حاجی عبدالرحمن ایک بنیے کے بیٹے تھے، خود مسلمان ہوئے اور پھر چودہ سو آدمیوں کو مسلمان کیا۔ پھر مسلمان کرکے چھوڑ نہیں دیا، شادی، بیاہ، کام کاج' روزگار سے لگانا، تعلیم دلانا سب کام کرتے تھے اور ہاں ہمارے علامہ شبلی رحمۃ اللہ رحمۃ" واسعۃ بھی تو بالآخر ایک نومسلم خاندان میں سے تھے اور یوں تو علامہ اقبال بھی۔

یہ بات خیال میں رہے کہ اب ہر شہر کی جماعت خود کفیل ہے اور جب سے جامعہ محمد بن سعود (ریاض) نے ان جماعتوں کو اپنی تنظیم میں لے لیا ہے آدھا خرچہ وہ دیتی ہے، اس سال ہمارا بجٹ ۳۵ لاکھ کا تھا (ریال سعودی)

ایک غیر متعلق بات ہے۔ محض معلومات کے لیے عرض کر رہا ہوں کہ اس سال پاکستان سے عمرہ کے لیے ۵۵ ہزار آدمی آئے ہیں (رمضان میں) دو لاکھ کی درخواست تھی، حکومت انتظام نہیں کرسکی۔ فال نیک ہے۔

اس تعداد کی رسمی یعنی سرکاری تصدیق ابھی نہیں ہوسکی۔ ورنہ یوں افواہ تو ستر ہزار تک ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

عبدالملک جامی

مکتوب علی گڑھ

بسمہٖ تعالیٰ

علی گڑھ

۲ شوال ۱۴۱۰ھ/ ۲۸ اپریل ۱۹۹۰ء

محبی! سلام شوق

ابھی ابھی معارف کا شمارہ آیا[1] اس سے پہلے کے شمارے سے بہتر ہے۔ سرسری طور پر چند امور جو محل نظر ہیں، حسب ذیل ہیں:

ص ۲۷۱، حاشیہ ۲ دریائے آمو دریا درست نہیں، دریائے آمو یا آمو دریا لکھنا چاہیے۔ شاش چاچ کا معرب ہے اور یہی چاچ جدید تاشقند یا تاشکند جو جمہوری ازبکستان کا مرکز ہے۔ محمد تغلق کے دور کا مشہور فارسی شاعر بدر چاچی کا تعلق اسی چاچ سے تھا، چاچ دریائے سیحوں کے کنارے واقع ہے۔

ص ۲۷۵ سیف الدولہ ابن حمدان = ابوالحسن علی بن ابوالھیجا عبد اللہ بن حمدان حمدانیان موصل کا دوسرا فرمانروا تھا اس کا باپ ابوالھیجا موسس خاندان تھا جو ۲۹۲ھ میں موصل اور اس کے توابع کا حکمراں منتخب ہوا، ابوالحسن علی ۳۳۳ میں جلوس آرا ہوا اس کی وفات ۳۵۶ھ میں ہوئی رومیوں سے کامیاب جنگ کے نتیجے میں خلیفۂ بغداد سے سیف الدولہ کا لقب ملا۔

(کیا امام قفال کا لقب ذوالریاستین تھا، یا محض صاحب سیف و قلم ہونے کے باعث ان کو ذوالریاستین لکھ دیا گیا ہے[2])

ص ۲۸۶ فرہنگ ابوحفص سعدی[3] کے بجائے سغدی (س غ دی) درست ہے،

---

[1] پہلے دونوں خطوط لکھے جا چکے تھے کہ یہ خط موصول ہوا جسکو فاضل مکتوب نگار کے شکریے کیساتھ شایع کیا جا رہا ہے [2] جی ہاں صاحب سیف و قلم ہونے کی بنا پر ذوالریاستین لکھا گیا ہے [3] سہو کتابت ہے۔

قنا (الطالبین[1]) کے بجائے قنیۃ الطالبین ہونا چاہیے۔

ص ۳۱۱ لیکن اس کے باوجود تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکال لیتے۔ تصنیف و تالیف و تحقیق و مطالعہ درس و تدریس کا لازمہ ہے، لہذا اس کے لیے وقت نکالنے کا فقرہ غیر ضروری ہے۔

یہ نہ خیال کریں کہ میں معارف پر نکتہ چینی کر رہا ہوں[2]، بلکہ میری خواہش ہے کہ اس کا معیار بلند سے بلند تر ہو، اور اس کے مضامین میں کوئی خامی نظر نہ آئے[3]۔

مخلص

نذیر احمد

[1] مضمون نگار کا سہو ہے [2] ہرگز نہیں بلکہ اس کے لیے ہم آپکے بیحد ممنون ہیں، [3] جزاک اللہ۔

ادبیات

غزل

از

جناب رئیس نعمانی، علی گڑھ

چہ تہمت بر سرش اے دل بہ آن شیرین شمایلہا
رواجِ شہرِ ما گر دید چون آزردنِ دلہا

مپرس احوالِ طوفان زادگانِ قلزمِ الفت
مبارک باشدت، اے دوست عشرت گاہِ ساحلہا

اگر بینی رخِ او ہمچو من دیوانہ خواہی شد
مزن ای ناصحِ ناداں لمن این حرفِ باطلہا

نہ چون جمعیتِ خاطر بہ اہلِ دل حرام آید
پسند خاطرش افتاد چون آشفتن دلہا

دلم بر فکرست اندیشگانِ شوق می سوزد
سخن از جلوہ گفتند و پرستیدند حایلہا

بہ تاریکی پرستان، حرفہای روشنی گفتم
بہ خانہ آگہی دادم رقیبان را ز منزلہا

نصیب او مبادا در دو عالم ہیچ آسانی
کسی کز غیرِ حق دارد امیدِ حلِّ مشکلہا

مشو نومید از رحمت، چو در دامِ بلا افتی
تماشا کن، چہ گلہا می دمد از پردۂ گلہا

پس از جہد و عمل، عاقل توکل بر خدا دارد
بغیرِ سعی دارند ابلہان امّیدِ حاصلہا

رئیسؔ از من حدیث شہر خوبانِ ادب بشنو
نیم از ساربانان تا کہ گویم حرفِ محملہا

مطبوعات جدیدہ

انوار الباری اردو شرح صحیح البخاری — مرتبہ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری، تقطیع کلاں، کاغذ و کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۸، قیمت ۳۰ روپے۔

پتہ: مکتبہ ناشر العلوم بجنور، یو۔ پی

مولانا احمد رضا بجنوری مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذ ہیں، وہ انوار الباری کے نام سے صحیح بخاری کی مبسوط شرح لکھ رہے ہیں جس کی متعدد جلدیں شایع ہو چکی ہیں، زیر نظر جلد میں یہ صحیح بخاری کی کتاب الجنائز اور کتاب التوحید و العقائد کے ابواب زیر بحث آئے ہیں۔ ہماری نظر سے اس کی پہلی جلدیں نہیں گزری ہیں، لیکن اس کے رد میں لکھی جانے والی بعض کتابیں گذری ہیں جن کے بارے میں ہماری رائے اچھی نہیں تھی مگر یہ شرح دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ ان کے مصنفین کی برہمی بہت بیجا نہ تھی۔ کیونکہ اس میں اصل متن حدیث کی شرح اور دوسری مشکلات سے تو کم تعرض کیا گیا ہے اور اصل زور اس پر صرف کیا گیا ہے کہ احناف کا فقہی و کلامی مذہب درست اور حدیث کی منشا کے عین مطابق ہے اس اعتبار سے یہ بخاری کی شرح کم اور حنفی مذہب کی مدلل تائید اور محدثین اور غیر حنفی مذاہب کے علماء و محققین کی تردید پر زیادہ مشتمل ہے جس کی وجہ سے یہ بحث و مناظرہ کی کتاب معلوم ہوتی ہے، جا بجا مباحث اور دلائل کا تکرار ہے

اکثر بحثیں بلاضرورت طویل ہوگئی ہیں جو غیر متعلق بھی ہیں، مثلاً کتاب التوحید والعقائد کا بڑا حصہ صرف امام ابوحنیفہؒ کی مدح و منقبت کی نذر ہوگیا ہے اور اس میں ان کو تابعی اور سب سے بڑا محدث ثابت کرنے پر زیادہ توجہ کی گئی ہے، مصنف کے نزدیک تقلید، حنفیت اور دیوبندیت سے اختلاف غالباً کسی حال میں بھی روا نہیں، حافظ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ نیز مولانا شبلیؒ علمائے ندوہ اور سلفی حضرات کو اسی جرم میں مطعون کیا گیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہی ابن تیمیہؒ جن کی تحقیقات اور دلائل مصنف کی نظر میں ناقابل اعتنا ہیں جب ان کے مطلب کی کوئی بات کہہ دیتے ہیں تو وہ بلادلیل بھی تسلیم کے لائق ہوجاتی ہے، مصنف نے اپنی کتاب کو مولانا محمد انور شاہ کے افادات کا مجموعہ بتایا ہے جبکہ ان کے یہاں اس طرح کی شدت اور غلو پسندی نہیں ہے بلکہ وہ تمام علمائے دیوبند میں اپنے توسع اور بے تعصبی کے لیے ممتاز ہیں کسی مخصوص اور پہلے سے طے شدہ رائے و مسلک کے مطابق احادیث کو ڈھالنا شرح و تحقیق کا کوئی علمی و معروضی انداز نہیں ہے، کتاب کی زبان و بیان عام فہم نہیں ہے اور جن مسائل و مباحث کا ذکر اس میں ہے وہ بھی عام لوگوں کے ذوق کی چیز نہیں ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۵۶
(سیمینار کے مقالات) مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۵ روپیہ، ناشر: بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۴۔

سنہ ۸۴ و سنہ ۸۵ء میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تقریبات ان کے یوم ولادت کی مناسبت سے پورے برصغیر میں منائی گئیں، ان کا اصل وطن بہار تھا۔ اس لیے

بہار اردو اکادمی پٹنہ نے بھی اس موقع پر ایک سیمینار کیا تھا جس میں ہندوستان کے مختلف حصوں کے اہل علم شریک ہوئے، زیر نظر کتاب اسی سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے، حضرت سید صاحبؒ جامع کمالات تھے وہ مدۃ العمر علم و فن کی خدمت انجام دیتے رہے اس لیے ان کے کارنامے نہایت گوناگوں اور اہم ہیں یہ کتاب سترہ محققانہ اور اہم مقالات پر مشتمل ہے ان میں ان کی سیرت و شخصیت کے جلوے بھی دکھائے گئے ہیں اور ان کے علمی و تعلیمی کمالات اور تحقیقی و ادبی خدمات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے، بعض مضامین میں ان کے صوفیانہ اور شاعرانہ ذوق کا ذکر ہے، اس طرح اس کتاب سے ان کے فضل و کمال کے مختلف پہلو سامنے آجاتے ہیں، سب سے پہلا مقالہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم سابق ناظم دارالمصنفین کا ہے اس میں ان کے حالات و سوانح اور مختلف النوع کارناموں کا احاطہ بڑے دلکش انداز میں کیا گیا ہے، ڈاکٹر عبدالمغنی، ڈاکٹر لطف الرحمان، ڈاکٹر شیخ فرید، ڈاکٹر سید حامد حسین اور ڈاکٹر خورشید نعمانی کے محققانہ مضامین سے بھی مجموعہ کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، عبدالقوی دسنوی، شہباز حسین اور مولوی عمیر الصدیق رفیق دارالمصنفین کی تحریریں بھی اس کی زینت میں اضافہ کرتی ہیں، راقم نے سیرۃ النبیؐ جلد سوم کی خصوصیات پر گفتگو کی ہے، یہ مجموعہ رنگارنگ، مفید اور دلآویز نگارشات پر مشتمل اور سلیمانیات کے ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہے، اس کی اشاعت پر بہار اردو اکادمی مستحق تحسین ہے۔

اسلام، عورت اور عصر حاضر مرتبہ جناب رخسانہ نکہت لاری ام ہانی صاحبہ، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، خوبصورت ٹائٹل، صفحات ۲۰۸، قیمت ۲۵ روپیہ، پتہ: دین و دانش پبلی کیشنز، عظیم آباد کالونی، پٹنہ۔

جناب رخسانہ نکہت لاری ام ہانی صاحبہ کو علم و ادب اور تحریر و تصنیف کا اچھا ذوق اور نظم و نثر دونوں پر قدرت ہے، اس نثری تصنیف سے ان کے دینی شغف، ملی درد، مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے بیقراری اور تحریر و تصنیف کے سلیقہ کا اندازہ ہوتا ہے، یہ کتاب متفرق دینی و اصلاحی مضامین کا مجموعہ ہے، مضامین کے ابتدائی حصہ میں دکھایا گیا ہے کہ اسلام ایک فطری اور اصولی مذہب ہے جس کی تعلیم و ہدایت میں بڑا اعتدال و توازن ہے مگر مسلمان اسے ترک اور دوسروں کی نقالی اختیار کرکے آج جس قعر مذلت میں جا پھنسے ہیں اس سے نکلنے کی صورت یہی ہے کہ وہ اپنے مذہب پر کاربند ہوکر ان اخلاقی خوبیوں سے متصف ہو جائیں جن کی اسلام نے انہیں تلقین کی ہے، اتحاد و ہم آہنگی اور سعی و محنت ہی سے ان کی زندگی کی شب تاریک سحر میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ دوسری نوعیت کے مضامین میں عورت کے متعلق قرآن مجید کی تعلیم کا لب لباب بیان کرکے دکھایا ہے کہ یہ عورتوں کے فطری ذوق و مزاج اور حالات کے لحاظ سے بالکل موزوں ہے، اس کے مقابلہ میں عہد حاضر میں اس کو جو سماجی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اس سے اس کو بیجا آزادی تو مل گئی ہے اور وہ مردوں کے دوش بدوش کام کرنے لگی ہے لیکن اس غیر فطری آزادی سے ہر طرح کی تباہی و بربادی رونما ہو رہی ہے، جس سے اس کا سماجی درجہ اونچا ہونے کے بجائے مزید گرتا جا رہا ہے، اسی ضمن میں اسلامی تحریک کو فروغ دینے کے لیے مسلم طالبات کی ذمہ داریاں بھی بتائی گئی ہیں، چند مضامین میں معراج، شب برأت، رمضان، عید، حج، قربانی کی فضیلت و حقیقت پیش کی گئی ہے، شہادت حسینؓ کا پیام اور تعظیم رسولؐ کا مطلب بھی واضح کیا ہے، آخر میں حضرت خدیجہؓ، عائشہؓ، فاطمہؓ، مریمؑ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نیز فرعون کی بیوی کا مختصر حال تحریر کیا ہے جو مسلم خواتین کے لیے بڑا سبق آموز ہے، موجودہ معاشرہ اور عورتوں کی اصلاح کے لیے یہ ایک مفید کتاب ہے۔

الدین القیم، اسلام اور اشتراکیت، مجلہ بیادگار مولانا ابو سلمہ شفیع احمد مرحوم اور مولانا ابو سلمہ شفیع احمد مرحوم حالات و تاثرات کے آئینہ میں

اول الذکر کتاب کے مرتب مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم ہیں، صفحات ۲۴۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴۰ روپیے۔ دوسری کتاب کے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم ہیں، صفحات ۱۱۶ اور مفت ملے گی۔ سب کے ملنے کا پتہ: ادارۂ ترجمہ و تالیف نمبر ۲ بہول بگان روڈ، کلکتہ ۱۴۔

مولانا ابو سلمہ شفیع احمد صاحب مرحوم متبحر علما اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے لائق اساتذہ میں تھے، وہ بڑے اچھے مقرر اور خطیب تھے، برسوں کلکتہ کے امام عیدین رہے، علمی ہونے کے ساتھ وہ عملی بھی تھے، ان کی مجاہدانہ سرگرمیاں کلکتہ والوں کو برابر یاد رہیں گی، مولانا مرحوم دار المصنفین کے بھی بڑے قدرداں اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے رتبہ شناس تھے، ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ مولانا ابو سلمہ مرحوم ہی نے مرتب کرکے شایع کیا تھا، انھوں نے مفید اصلاحی و دینی کتابیں شایع کرنے کے لیے کلکتہ میں ادارۂ ترجمہ و تالیف کی داغ بیل ڈالی تھی جس کو ان کے خلف الرشید مولوی طلحہ بن ابو سلمہ ندوی ترقی و استحکام دینے کے لیے برابر جد و جہد کر رہے ہیں، الدین القیم اور اسلام اور اشتراکیت کی دوبارہ طبع و اشاعت اسی سلسلہ کی کڑی ہے، ان دونوں کتابوں کی اہمیت و خصوصیت سے علمی طبقہ پوری طرح واقف ہے، موخر الذکر کتاب پہلی دفعہ دار المصنفین نے شایع کی تھی، مولانا ابو سلمہ کے نام نیک کو ضیاع سے بچانے کے لیے لائق فرزند نے سنہ ۸۷ء اور سنہ ۸۹ء

میں دو مجلے شائع کیے تھے جو مشہور اصحاب علم و قلم کے تاثرات و مکاتیب پر مشتمل ہے، ان تحریروں سے مولانا کی سیرت و شخصیت کے خط و خال نمایاں ہوتے ہیں اور انکے علمی کمالات اور عملی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے، ان مفید علمی و دینی کتابوں کی اشاعت کے لیے ادارۂ ترجمہ و تالیف کے ناظم کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔

دانش آخر الزماں مرتبہ جناب نشور واحدی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۶، قیمت ۳ روپیے، پتہ: ۹۸/۲۳، ناظر باغ، کانپور۔

جناب نشور واحدی ایک بلند پایہ شاعر ہی نہ تھے بلکہ عربی و فارسی کے منتہی بھی تھے، ان کا علم و مطالعہ وسیع تھا اور تصوف و فلسفہ پر بھی گہری نظر تھی، آخر عمر میں نثر نگاری کی جانب ان کا میلان زیادہ ہو گیا تھا، اسی زمانہ میں "خودی" پر ان کی عالمانہ کتاب دیکھنے میں آئی تھی، زیر نظر کتاب بھی ان کی زندگی میں چھپ گئی تھی، انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ اپنی خاص حکمت و دانش سے بہرہ ور کرتا ہے، اس کتاب میں پیغمبر آخر الزماں کی حکمت و دانش کو تین حصوں مبادیات، فکریات اور تعلیمات کے زیر عنوان پیش کیا گیا ہے لیکن اولاً تو یہ حکمت سے زیادہ تصوف کے دقیق مسائل و مباحث ہیں دوسرے ان کی تعبیر فلسفیانہ انداز میں کی گئی ہے جو عام فہم نہیں ہے تاہم شریعت و طریقت کے کوچوں سے آشنا لوگوں کے لیے اس میں کیف و سرور کا پورا سامان ہے۔

نعتیہ شاعری کا ارتقا مرتبہ ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۲۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۸۰ روپیے، پتے (۱) دانش محل امین آباد، لکھنؤ (۲) ساجری، فتحپور۔ یو۔ پی ۲۱۲۶۰۱

نعت شاعری کی مقبول صنف سخن ہے اور ہر زبان کے شعراء نے اس میں طبع آزمائی

کی ہے، نعتیہ شاعری پر متعدد کتابیں اور مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ یہ نئی کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں نعت کے تعلق سے پہلی مرتبہ بعض امور پر سیر حاصل بحث و گفتگو کی گئی ہے، جیسے نعت کی ساخت اور نعت گوئی کے آداب بیان کیے ہیں تاکہ اسے افراط و تفریط سے محفوظ رکھا جائے، نعت و معتقدات کے زیر عنوان دکھایا ہے کہ عقیدہ کی صحت و صداقت کے بغیر نعت جوش و وارفتگی، خلوص، پاکیزگی اور اثر انگیزی سے خالی رہتی ہے اسی طرح نعت میں غلط اور جھوٹی روایتوں کے منظوم کیے جانے کے اسباب بتائے ہیں اور تلمیح کی کثرت کا مقصد بھی واضح کیا ہے اور نعت میں منعوت کے سوانح حیات کے عناصر کی نشاندہی کی ہے، یہ ساری بحثیں مفید اور لائق توجہ ہیں، دوسرے باب میں عربی کے نعت گو شعرا کا تذکرہ دو فصلوں میں کیا ہے پہلی فصل میں عہد نبوت کے نعت گو شعرا کے کلام کا نمونہ دیا ہے اور دوسرے میں آپ کے بعد سے اب تک کے نعت گو شعرا کا مختصر حال اور کلام درج ہے، تیسرے باب میں پہلے تو فارسی میں نعت گوئی کی ابتدا و ارتقا کا ذکر ہے اور آخر میں نعت کے مشہور شعرا کا۔ اس طرح اس کتاب میں عربی و فارسی کی نعتیہ شاعری کا مفصل جائزہ لے کر مصنف نے ایک مفید ادبی و دینی خدمت انجام دی ہے، ان کا مقصد استقصا نہیں ہے اس لیے انھوں نے اس میں ہر عہد کے نمائندہ شعرا کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، بعض شعرا کے مختصر حالات قلمبند ہونے سے رہ گئے ہیں، گو یہ کتاب تلاش و محنت سے لکھی گئی ہے لیکن اس میں بعض تحقیق طلب امور سے تعرض نہیں کیا گیا ہے جیسے قدسی کا مختصر حال لکھنے کے بعد ان کی طرف منسوب مشہور نعت نقل کی ہے جس کو اب بعض محققین قدسی کی نہیں مانتے، اسی طرح خواجہ معین الدین چشتی کی طرف جو دیوان منسوب ہے، موجودہ محققین اسے ان کا دیوان تسلیم نہیں کرتے،

کتابت وطباعت کے اغلاط بکثرت ہیں صـ۱۲۱ پر کثیرۃ الرجفان کا یہ ترجمہ "اس پر زمزمہ کی کیفیت طاری ہے" صحیح نہیں ہے، زمزمہ کے بجائے زلزلہ یا کپکپی لکھنا چاہیے تھا'

احتشام حسین ایک مطالعہ مرتبہ ڈاکٹر اخلاق اثر صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۸۰، مجلد مع گردپوش، قیمت ۲۵ روپیے، ناشر طارق پبلی کیشنز صادق منزل، چوک امام باڑہ بھوپال،

ڈاکٹر اخلاق اثر اردو کے اچھے اہل قلم اور محقق ونقاد ہیں، وہ کم لکھتے ہیں مگر جو کچھ لکھتے ہیں غور و فکر اور مطالعہ وتحقیق کے بعد لکھتے ہیں اس لیے انکی رائے میں سنجیدگی اور وزن ہوتا ہے، اس مختصر کتاب میں انھوں نے اردو کے مشہور نقاد پروفیسر احتشام حسین کی شخصیت اور کارناموں کے بعض ایسے پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا ہے جن پر یا تو کم لکھا گیا ہے یا جن کے بارے میں کچھ غلط فہمی رہی ہے یہ کتاب چھ مضامین کا مجموعہ ہے، پہلے مضمون میں مدھیہ پردیش کے بعض ارباب قلم کے نام کے احتشام صاحب کے مکاتیب کا تجزیاتی مطالعہ کرکے انکی شخصیت کے نقوش اور انکی زندگی کے متعدد پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے، ان مکاتیب میں جو متنوع علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی موضوعات زیر بحث آئے ہیں ان سے احتشام صاحب کے افکار وخیالات سے بھی واقفیت ہوتی ہے، اور انکے عہد اور ہم عصروں کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتے ہیں، دوسرے مضمون میں احتشام صاحب کی مقدمہ نگاری کے پہلوؤں کی جانب توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ انکی انسان دوستی، مروت اور تبصرہ نگاری کو مبالغہ سے پیش کیا گیا ہے، "احتشام حسین اور اردو ڈراما" میں اس خیال کی تردید کی ہے کہ "انھوں نے ڈرامے نہیں لکھے" اور دلائل وشواہد سے ثابت کیا ہے کہ ان کو ڈراما نگاری سے دلچسپی تھی اور انھوں نے ڈرامے بھی لکھے' ایک اور مضمون میں مدلل طور سے دکھایا ہے کہ افسانہ نگاری ترک کر دینے کے بعد بھی احتشام صاحب افسانے میں پوری دلچسپی لیتے تھے اور اپنے تنقیدی مضامین میں انھوں نے انکے متعلق جو اظہار خیال کیا ہے اس سے افسانوں کے بارے میں انکے نظریے کا پتہ چلتا ہے، آخری دونوں مضامین میں مدھیہ پردیش کے تعلق سے انکی تاثراتی تحریروں اور تقریروں پر بحث وگفتگو کرکے مفید نکتوں کی جانب توجہ دلائی ہے۔

"ض"